جماعت اسلامی

کا

مقصد اور طریقِ کار

مولانا ابواللیث ندویؒ

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ذیل میں مولانا ابواللیث ندوی امیر جماعت اسلامی ہند کا وہ مقالہ درج کیا جارہا ہے جو ۲۲؍اپریل ۱۹۵۱ء کو کل ہند اجتماع جماعت اسلامی منعقدہ رام پور کے آخری اجتماع عام میں پڑھ کر سُنایا گیا تھا۔ مقالے میں مولانا نے مختصراً فرمایا:

کل سے آپ نے ہمارے مختلف رفقا کی زبانی تین تقریریں سنیں۔ دو تقریروں میں موجودہ مقبول عام نظریات پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ کس طرح دنیا اور بالخصوص ہندستان کے موجودہ مسائل کو حل کرنے میں ناکام ہیں اور تیسری تقریر میں کچھ اختصار کے ساتھ اس بات کی طرف اشارے کیے گئے ہیں کہ اُن کے حل کی صحیح صورت کیا ہوسکتی ہے۔ اب اس ضمن کی صرف ایک آخری تقریر باقی رہ گئی ہے، جس میں یہ وضاحت کی جائے گی کہ جماعت اسلامی کیا چاہتی ہے اور جو کچھ چاہتی ہے اس کو وہ کس طرح حاصل کرنا چاہتی ہے؟ یہ تقریر میرے فرائضِ منصبی کے لحاظ سے مجھے کرنی تھی اور میں چند دن پہلے تک یہی خیال کر رہا تھا کہ اس سوال کے ضمن میں مجھے جو کچھ عرض کرنا ہے، اُسے میں زبانی عرض کردوں گا، لیکن مجھے محسوس ہورہا ہے کہ ہمارے خیالات کے سلسلے میں ہم پر بڑا ظلم کیا جارہا ہے۔ بہت سے لوگ ہماری باتوں کو غلط سلط بیان کرتے ہیں بلکہ نہایت غلط اور بے بنیاد باتیں ہماری طرف منسوب کردی جایا کرتی ہیں اور آج کل تو خصوصیت کے ساتھ یہ کام وسیع پیمانے پر ہورہا ہے۔ اس لیے یہ مناسب معلوم ہوتا

ہے کہ جماعت کے مقصد اور اس کے طریق کار کے بارے میں، میں جو کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں اسے تحریری شکل میں بیان کردوں تاکہ باتیں ٹھیک طور سے ادا ہوں اور ٹھیک طور پر سمجھی جائیں۔ میں نے اپنی باتیں قلم بند کر لی ہیں اور وہی تحریر اس وقت آپ کے سامنے پڑھ کر سنائی جائے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری اس احتیاط کے باوجود جو لوگ غلط فہمیاں پھیلانے کا ارادہ ہی کر چکے ہیں وہ اس کے بعد بھی باز نہیں آسکتے لیکن ظاہر ہے اس احتیاط کے سوا ہمارے پاس ان لوگوں کو ان کی اس حرکت سے باز رکھنے کی کوئی دوسری تدبیر نہیں ہے۔

جماعتِ اسلامی اور اُس کا مقصد

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِیَ لَهٗ ط وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗo صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَo

محترم حاضرین! ہمارا یہ بنیادی عقیدہ ہے اور کچھ افراد کو چھوڑ کر پوری دنیا اس عقیدے سے اتفاق رکھتی ہے کہ دنیا خود بخود پیدا نہیں ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ بلکہ اس کا ایک خالق ہے، جس نے اپنی مشیّت سے اس دنیا اور اس کی تمام چیزوں کو، جن میں انسان بھی داخل ہے، پیدا کیا ہے اور وہی اس کا تنہا مالک اور فرماں روا ہے اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ''خبردار! خلق اور امر دونوں اسی کے ہیں۔''

انسان کے ماسوا جتنی چیزیں ہیں، وہ سب اس کی مرضی کے تابع ہیں۔ ان کے خالق و مالک نے ان کو جس حال میں رکھنا چاہا رکھ دیا ہے اور اس حال پر رہنے کے لیے وہ سب مجبور ہیں۔ ان میں سے کسی میں یہ یارا نہیں کہ وہ اس سے سرِ مو انحراف کر سکے۔ سورج، چاند اور ستارے طلوع و غروب کے لیے آزاد نہیں ہیں۔ بلکہ وہ ایک متعین مدار اور نظامِ اوقات کے پابند ہیں اور یہ اُن کے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ اس کی ذرّہ برابر خلاف ورزی کر سکیں۔ رات دن کے آنے جانے کے لیے جو قاعدہ مقرر کر دیا گیا ہے، وہ اُس کے پابند ہیں۔ اس کو توڑنے کی اُن میں قدرت نہیں ہے:

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ؕO
وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ کَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ O
لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَآ اَنْ تُدْرِکَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ
النَّهَارِ ؕ وَ کُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ O (یٰس:۳۸-۴۰)

"سورج اپنے مستقر کی طرف چلا جا رہا ہے۔ یہ ایک زبردست اور صاحبِ علم کا ٹھیرایا ہوا اندازہ ہے اور چاند کی منزلیں ہم نے مقرر کر دی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنی پہلی کجی کی طرف پلٹ آتا ہے۔ نہ سورج کی یہ مجال کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات کی یہ مجال کہ دن سے پہلے آ جائے۔ سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔"

ہواؤں کا چلنا، موسم کی تبدیلی، یہ تمام چیزیں بندھے ٹکے اصول وضوابط کے تحت وجود وظہور میں آتی ہیں اور اُن میں کبھی فرق واقع نہیں ہوتا۔ جمادات وحیوانات ہر ایک کے پیدا ہونے، بڑھنے اور پھلنے پھولنے کے قواعد وضوابط مقرر ہیں، جن میں کبھی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ غرض یہ پوری کائنات ایک مضبوط نظام کی رسی میں جکڑی ہوئی ہے، جس کا سرا خدا کے دستِ قدرت میں ہے، وہ اپنی مرضی سے اس پر حکومت کرتا ہے اور تمام کائنات اس کے حکم ومشیت کے آگے سرنگوں ہے۔

وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ O (آل عمران:۸۳)

"اسی کے آگے سرفگندہ ہیں وہ جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں۔"

اور خود انسان بھی جو بظاہر اس دنیا کا فرماں رواں ہے وہ بھی اپنی زندگی کے بہت سے گوشوں میں دوسری چیزوں کی طرح عاجز و بے بس ہے اور اپنے سے بالاتر قوت کی مرضی ومشیّت کے آگے جھکنے پر مجبور ہے۔ یہ کسی انسان کے بس میں نہیں ہے کہ وہ خود پیدا ہو جاتا یا پیدا ہو جانے کے بعد وہ اپنے کو موت کی آغوش میں جانے سے محفوظ رکھ سکے، اس کی پیدائش اس کا رنگ روپ، اس کی عمر، اس کی صحّت ومرض، اس کی غربت وتونگری، اس کا کسی خاص نسل ونسب یا خاندان وقبیلہ اور ملک میں پیدا ہونا یہ تمام چیزیں اس کے دائرۂ اختیار سے باہر ہیں۔ اس کے خالق نے اسے جس حال میں رکھ دیا ہے یا جس حال میں رکھنا چاہتا ہے وہ چار و ناچار کائنات کی دیگر اشیاء کی طرح اسی حال میں رہنے پر مجبور ہے۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ○ (الرعد: ۱۵)

''اور اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں راضی خوشی اور مجبوراً اور اُن کے سایے بھی صبح وشام۔''

لیکن اسی کے ساتھ انسان کے اندر ایک اور چیز بھی پائی جاتی ہے، جس کی وجہ سے اس کا وجود دنیا کی دیگر اشیاء کے مقابلے میں کچھ مختلف اور ممتاز نظر آتا ہے اور وہ یہ کہ جہاں وہ اپنی زندگی کے بہت سے گوشوں میں دوسری مخلوقات کی طرح خدا کی مشیّت کا تابعِ فرمان نظر آتا ہے، قطعِ نظر اس کے کہ وہ اس کو تسلیم کرتا ہو یا نہ کرتا ہو، وہیں بعض دوسرے گوشوں میں ایسا نظر آتا ہے کہ وہ اپنے ارادۂ اختیار میں کچھ آزاد بھی ہے۔ وہ آزادی سے چل پھر سکتا ہے۔ پہاڑوں اور درختوں کی طرح اپنی جگہ قائم اور ثابت رہنے پر مجبور نہیں ہے، وہ جہاں چاہے آجا سکتا ہے، دریاؤں کی طرح کسی خاص سمت میں سفر کرنے کا پابند نہیں ہے، وہ حرکت و اقدام، سعی و عمل کی آزادی رکھتا ہے۔ حیوانات کی طرح خاص خاص طرح کی فکری جکڑ بندیوں میں جکڑا ہوا نہیں ہے اور وہ اپنی اس آزادی کو آزادانہ استعمال کرسکتا ہے۔ اور کرتا ہے۔ یہاں تک کہ بسا اوقات وہ خود اس گھمنڈ میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ وہ واقعتہً ہر پہلو سے آزاد ہے اور اس پر کسی بالاتر ہستی کی فرماں روائی قائم نہیں ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؕ (الحج: ۱۸)

''کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ کے آگے سر بسجود ہیں وہ سب جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، سورج اور چاند اور تارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے انسان اور بہت سے وہ لوگ بھی جو عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں؟''

انسان کو جو یہ آزادی دی گئی ہے اسے وہ بناؤ میں صرف کرسکتا ہے اور بگاڑ میں بھی، اس سے وہ فساد پھیلانے کا کام بھی لے سکتا ہے اور نیکی اور صلاح پھیلانے کا بھی، اگر وہ چاہے تو اُسے اپنے خالق و مالک کے پہچاننے میں اور اس کے حق ادا کرنے میں استعمال کرے۔ اور چاہے تو اُسے

اس کے انکار اور اس کے حق تلف کرنے میں صرف کرے۔ اللہ نے خود اپنی مرضی سے اُسے یہ اختیار عطا کیا ہے اس لیے وہ اس کو کسی خاص طریق کے مطابق استعمال کرنے پر اُسے مجبور نہیں کرتا، کیوں کہ اس سے مقصود اس کا امتحان اور آزمائش ہے کہ وہ اپنے حق کو کس طرح استعمال کرتا ہے۔

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا ۝ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝

(الدھر: ۲، ۳)

''ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفہ سے پیدا کیا اس حال میں کہ اسے آزمائیں۔ پس اُسے سُننے اور دیکھنے والا بنایا ہم نے اُسے راہِ راست دکھادی ہے اب چاہے تو وہ شکر گزاری کا رویہ اختیار کرے اور چاہے تو ناشکرا بن جائے۔''

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۭ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ (یونس: ۹۹)

''اگر تمہارا رب چاہتا تو زمین کے رہنے والے سارے کے سارے مومن ہوجاتے تو کیا اے پیغمبر تم اُن لوگوں کو مجبور کردو گے کہ وہ ایمان لائیں۔''

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اس وقت کے ہر طرح کے استعمال کو یکساں پسند کرتا ہے، یا یہ کہ اس قوت کا ہر طرح کا استعمال انسان کے لیے یکساں طور سے مفید اور نافع ہوسکتا ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس قوت کے بعض استعمالات انسان کے لیے مفید اور بعض اس کے لیے مضر اور تباہ کن ہوسکتے ہیں۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ ۙ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ ۙ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ ۙ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝ ۭ (الشمس: ۷-۱۰)

''گواہ ہے نفسِ انسانی اور اُس کا ٹھیک ٹھاک کیا جانا، پھر اس کے اندر بُرائی اور تقویٰ کا الہام کیا جانا کہ وہ شخص بامراد ہوا، جس نے اُسے پاک کیا اور وہ نامراد رہا، جس نے اسے دبا کر ناپاک کردیا۔ اور خود خدا اُن میں سے کچھ کو پسند اور کچھ کو ناپسند فرماتا ہے۔''

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ۝ ۭ مَا لَكُمْ ۣ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝ ۚ

(القلم: ۳۵، ۳۶)

''تو کیا ہم انجام میں اطاعت گزاروں اور مجرموں کو یکساں کردیں گے۔ تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ تم کیسے فیصلے کرتے ہو؟''

اس لیے وہ انسان کی خود مختاری کو برقرار رکھتے ہوئے جسے اس نے خود اپنی حکمت و مشیّت کے تحت عطا فرمایا ہے، یہ تو نہیں چاہتا کہ اسے بہ جبر وقوت اس کے صحیح استعمال پر مجبور کر دے لیکن چونکہ وہ پسند یہی کرتا ہے کہ انسان اس آزادی کو ٹھیک طور سے استعمال کرے اس لیے اس نے جہاں امتحان و آزمائش کے پیش نظر، شر کے محرکات پیدا کیے ہیں وہیں اس نے کچھ اس سے بھی زیادہ خیر کے محرکات بھی مہیّا کر دیے ہیں اور ان کے پہلو غالب رکھے ہیں تاکہ انسان اپنے اختیار کو اس کی رضا کے مطابق استعمال کر کے اس کی خوشنودی حاصل کر سکے۔ وہ اپنی زندگی کامیاب و بامراد بنا سکے۔ چنانچہ اسی غرض کے لیے اس نے جہاں انسان میں فطرتاً یہ صلاحیت رکھی ہے کہ خیر کی طرف اس کی زیادہ سے زیادہ رغبت ہو سکے اور اپنے رب کے تابع فرمان بننے کے لیے خود اس کی اندرونی کشش اسے مجبور کرتی رہے، وہیں اس نے اپنی رحمت سے ہر دور میں اپنے خاص خاص بندے بھی بھیجے جو اپنی تعلیم و تلقین نیز اپنے اسوۂ زندگی کے ذریعے بتا سکیں کہ انسان کو اپنی خود مختاری اور آزادی کس طرح استعمال کرنی چاہیے۔ چنانچہ اس طرح کے لوگ ہر دور اور ہر مُلک میں آئے اور انہوں نے مختلف طریقوں سے اس خدمت کو انجام دیا۔ ان حضرات کی تعلیم و تلقین کا بنیادی مرکز یہ رہا ہے کہ جب پوری کائنات خدا کے آگے سجدہ ریز اور اس کے احکام کی پابند ہے اور خود انسان بھی اپنی زندگی کے تکوینی حصّے میں چار و ناچار خدا کی ہی اطاعت کرتا ہے تو اس کے لیے یہی طریقۂ زندگی صحیح اور مفید ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے اختیاری شعبۂ زندگی کو بھی اس کی مرضی اور اس کے احکام کے تابع کر دے تاکہ فطرتِ کائنات سے اس کی ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔ ورنہ نتیجہ یہی ہو گا کہ وہ کائنات کے پورے چوکھٹے میں اپنی ہستی کو صحیح طور سے فٹ نہیں کر سکے گا۔ اور اس کا انجام اس کے حق میں تباہ کن ثابت ہو گا۔

اَفَغَيۡرَ دِيۡنِ اللّٰهِ يَبۡغُوۡنَ وَلَهٗۤ اَسۡلَمَ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ طَوۡعًا وَّكَرۡهًا وَّاِلَيۡهِ يُرۡجَعُوۡنَ۝ (آل عمران:۸۳)

”کیا یہ لوگ اللہ کے سوا کسی اور کا دین چاہتے ہیں حالانکہ آسمان اور زمین کی ساری چیزیں چار و ناچار اللہ ہی کی مطیع فرمان ہیں اور اسی کی طرف ان کو پلٹ کر جانا ہے۔“

انہوں نے اس تعلیم و تلقین کے ساتھ خود اپنی زندگی بھی اسی کے مطابق بسر کی اور اپنی پوری اختیاری زندگی کو اس کے جملہ اجزا سمیت اللہ کی اطاعت و انقیاد کے حوالہ کر دیا۔ اللہ کے ان

بندوں نے اپنی زندگیوں میں زندگی کے ہر طرح کے اشغال واعمال سے واسطہ رکھا ہے یہاں تک کہ اُن میں سے بہتوں نے حکومت وفرماں روائی بھی کی ہے۔لیکن جو چیز اُن کے جملہ اعمالِ حیات میں سب سے نمایاں حیثیت رکھتی ہے وہ یہی ہے کہ وہ اپنے اختیار وآزادی کی دولت پر متکبرّ نہیں ہوئے اور نہ اس کو انہوں نے اللہ کے احکام کی سرتابی میں صرف کیا بلکہ خدا کے حقیقی بندے بن کر انہوں نے زندگی گزاری اور اپنے اختیار وآزادی کو اس کی مرضی میں گم کر دیا۔اس طرز زندگی کے اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کا حقیقی خالق و مالک بھی اُن سے راضی اور خوش ہوا اور آج دنیا میں ہم اور آپ بھی سالہا سال گزرنے پر بھی اُن کا نام عزت اور احترام کے ساتھ لیتے ہیں۔اور جن لوگوں نے بھی اُن کے اُسوۂ زندگی کی پیروی کی ہے اور جب تک کی ہے وہ ہر طرح کی برکتوں اور نعمتوں سے مالا مال رہے ہیں۔اس طرح کے لوگ چونکہ ہر دور میں اور ہر قوم میں آئے ہیں۔ اس لیے یہ بات ہر قوم کی تاریخ میں نظر آتی ہے کہ تاریخ کے پچھلے ادوار میں ان کا وہ زمانہ بہت ہی روشن اور تابناک رہا ہے جب اس اسوہ کی پیروی کی گئی ہے۔چنانچہ ہر قوم اپنے اس طرح کے ادوار کو فخر ومسرت کے ساتھ یاد رکھتی ہے اور اگر چشمِ حقیقت بیں سے تاریخ کا مشاہدہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر قوم کے بگاڑ یا انحطاط کا زمانہ وہی رہا ہے جب اس نے اس طرز زندگی کو کلّی یا جزوی طور پر چھوڑ دیا ہے۔قرآنِ حکیم اسی بنا پر کہتا ہے:

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۵ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ (العصر:۱-۳)

"گواہ ہے زمانے کی کہ انسان گھاٹے میں ہے سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور اچھے اعمال کیے اور ایک دوسرے کو حق اور صبر کی وصیّت کی۔"

یہی طریقۂ زندگی جسے انبیاء کرامؑ نے خود اختیار کیا اور جس کو اختیار کرنے کی تلقین کی وہی ہماری زبان میں دینِ حق کہلاتا ہے۔اور اسی کو قائم کرنے کی جدوجہد کا نام اقامت دین ہے جو ہماری تمام جدوجہد اور سعی وعمل کا مرکز ہے۔

شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ وَمَا وَصَّیْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسٰٓی اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ ؕ (الشعوری:۱۳)

''مسلمانو! اللہ نے تمہارے لیے وہی دین (یعنی طریق زندگی) مقرر فرمایا ہے، جس کی وصیّت اس نے نوحؑ کو کی تھی اور جس کی وحی اے نبی ہم نے تمہاری طرف کی ہے اور جس کا حکم ہم نے ابراہیمؑ و موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دیا تھا یعنی یہ کہ ہمارے دیے ہوئے اس دین کو قائم کرو اور اس کے بارے میں ٹولیوں میں نہ بٹ جاؤ۔''

اور اسی کا دوسرا نام قرآن مجید میں شہادتِ حق ہے، جس کو انجام دینے کے لیے انبیاء کرامؑ دنیا میں تشریف لائے اور جس کی انجام دہی ان کے بعد ان کے پیرووں کا اصلی اور حقیقی مقصد قرار دیا گیا۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ لَتُبَیِّنُنَّہٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَکْتُمُوْنَہٗ ز (ال عمران:۱۸۷)

''اور جب کہ اللہ نے اہل کتاب سے عہد و پیمان لیا کہ وہ کتاب کی تعلیمات کو لوگوں پر ضرور واضح کرتے رہیں گے اور اسے چھپائیں گے نہیں۔''

قُلْ یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَھَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُھَدَآءُ ط وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○ (ال عمران:۹۹)

''کہہ دو اے اہل کتاب! تم ایمان لانے والوں کو اللہ کی راہ سے کیوں روکتے ہو؟ تم اس راہ راست کو کج بنا دینا چاہتے ہو حالانکہ تم اس کے گواہ تھے یاد رکھو جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔''

وغیرہ آیات سے واضح ہوتا ہے اور یہی شہادتِ حق امت مسلمہ کی بعثت کی حقیقی غرض ہے:

وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْدًا ط (البقرۃ:۱۴۳)

''اور اسی طرح یہ بات بھی ہوئی کہ ہم نے تمہیں ایک معتدل گروہ بنایا ہے تاکہ تم سارے انسانوں کے لیے حق کے گواہ بنو اور رسول تمہارے لیے گواہ بنے۔''

کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ ط (ال عمران:۱۱۰)

''تم وہ بہترین گروہ ہو جو سارے اہل جہان کی ہدایت کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دو گے، برائیوں سے روکو گے اور اللہ پر ایمان رکھو گے۔''

چنانچہ اسی بنا پر ہماری جدوجہد کا دوسرا نام شہادتِ حق ہے جو قرآنِ مجید کی اسی طرح کی آیتوں سے، جن میں مسلمانوں کی اصل حیثیت کو بیان کیا گیا ہے ماخوذ ہے اور یہی ہمارے نزدیک اسلام کے بھی معنی ہیں کیونکہ اس لفظ کے لغوی مفہوم اور شرعی استعمالات کی روشنی میں اس کے معنی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہیں کہ اللہ نے ہماری ہدایت کے لیے جو احکام اپنے نبیوں کے ذریعے نازل فرمائے ہیں اُن سے عہدہ برآ ہونے اور اُن کو عملاً نافذ کرنے کے لیے جدوجہد کی جائے اس لیے ہماری جدوجہد کا تیسرا نام اسلام ہے اور اسی کی مناسبت سے ہم اپنی تحریک کو تحریکِ اسلامی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

اس تشریح کے بعد آپ کو یہ اچھی طرح اندازہ ہو گیا ہوگا کہ جماعت اسلامی جس مقصد کے لیے قائم ہوئی ہے وہ خالصِ دینی مقصد ہے جس کی اہمیت وضرورت سے کوئی شخص انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ بعض لوگ اپنی ناواقفیت کی بنا پر یا دیدہ و دانستہ ہمارے بارے میں غلط فہمی رکھتے اور پھیلاتے ہیں کہ ہم نے اس چیز کو اپنا مقصود ٹھہرایا ہے، جو شریعت میں مقصود نہیں ہے اور اس کے لیے وہ لفظ ''حکومت الٰہیہ'' کی آڑ پکڑتے ہیں، جس کو ہم عام فہم لفظ سمجھ کر مذکورہ بالا قرآنی تعبیر کے لیے استعمال کرتے رہے ہیں۔ اُن کے نزدیک حکومت کے معنی صرف سیاسی اقتدار و غلبہ کے ہو سکتے ہیں اسی لیے وہ اس لفظ کو سُن کر ناک بھوں چڑھاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ چیز تو ثمرۂ طاعت یا خدا کا انعام ہے، اس کو مقصود بنانے کے کیا معنی ہیں؟ حالانکہ اس لفظ کا جو مفہوم اپنے ذہن میں رکھ کر وہ یہ وعظ ارشاد فرماتے ہیں وہ سرے سے ہمارے سامنے ہے ہی نہیں۔ ہم نے اس لفظ کو اس کے اصل لغوی مفہوم میں استعمال کیا ہے اور اس کے لحاظ سے اس کا مفہوم وہی ہے جو اسلام، اقامت دین یا شہادت حق کا ہے یعنی یہ کہ حاکم حقیقی جو اللہ تعالیٰ ہے اس کے جملہ احکام خواہ وہ زندگی کے کسی گوشے یا شعبے سے متعلق ہوں ان کو اپنے اوپر نافذ کرنے اور پوری تمدنی و معاشرتی زندگی میں قائم کرنے کی کوشش کرنا اور جب جب اور جہاں جہاں یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے اسی مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے اس لیے ہمارے نزدیک جو لوگ اس لفظ کا کوئی خود ساختہ مفہوم اپنے ذہن میں رکھ کر ہم پر اعتراضات کرتے ہیں وہ دانستہ یا نادانستہ طور پر ایک سخت غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

بہر حال یہ مقصود کی توضیح میں ایک ضمنی بات درمیان میں آ گئی ہے لیکن اس کو ختم کرنے سے پہلے میں یہ اظہار کر دینا بھی مناسب سمجھتا ہوں کہ چونکہ ہمارا مقصود کوئی لفظ نہیں بلکہ اس کا معنی ہے۔ اس لیے یہ دیکھتے ہوئے کہ خواہ مخواہ اس لفظ سے کچھ لوگوں کو نیک نیتی سے غلط فہمی لاحق ہوتی ہے اور کچھ لوگ اس کو اپنی مخالفت کا بے جا طور سے بہانہ بناتے ہیں ہم نے بالقصد اس کے بجائے اقامتِ دین اور شہادتِ حق وغیرہ کے الفاظ استعمال کرنے شروع کر دیے ہیں، جو خالص قرآنی الفاظ ہیں اور جن کے مدعا کے مقصود ہونے سے کسی شخص کو بھی انکار کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کے بعد ہمارے معترضین کا رویہ بھی بدلتا ہے یا اب وہ اعتراض کے لیے کوئی اور شگوفہ چھوڑنا چاہتے ہیں۔

دین کے بارے میں دو اہم غلط فہمیاں

اب تک میں نے جو کچھ عرض کیا اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ہمارا مقصودِ اعلیٰ دین کو قائم کرنا ہے، جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کو ہر قوم اور ہر امت میں ہر زمانے میں بھیجا ہے۔ اور جس کے لیے ان کے بعد اُن کے ماننے والے ہمیشہ مکلف قرار دیے گئے ہیں۔ اور جس پر انسان کی دنیاوی کامیابی و کامرانی اور اُخروی زندگی کی نجات و فلاح جو بہر صورت پیش آنے والی ہے موقوف ہے۔ اس بات کو سمجھ لینے کے بعد کہ ہمارا مقصود کیا ہے ہمارے اصول اور طریق کار کے بارے میں بہت سی بنیادی باتیں خود بخود سمجھ میں آ جانی چاہییں لیکن چونکہ اس مقصد کے لیے کام کرنے والوں کا کوئی نمایاں ظاہری نمونہ بدقسمتی سے لوگوں کے سامنے نہیں ہے اور خود ہمارا کام بھی ابھی تک اس پیمانے کا نہیں ہو سکا ہے کہ اس کو دیکھ کر اس نصب العین کے اصول و طریق کار کے بارے میں کوئی واضح نقشہ لوگوں کے ذہن میں آ سکے۔ بالخصوص ایسی حالت میں کہ ہم تعبیر مدّعا کے لیے جو الفاظ مثلاً اقامتِ دین وغیرہ استعمال کرتے ہیں، وہ لوگوں کے غلط اور ناقص استعمال کی وجہ سے اپنی حقیقت بہت کچھ کھو چکے ہیں اس لیے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ یہاں کچھ اختصار کے ساتھ اپنے چند بنیادی اصولوں کی کچھ شرح بھی کرتا چلوں۔

دین کا محدود تصوّر

دین کے بارے میں دو طرح کی غلط فہمیاں خود دینداروں میں بھی بہت عام ہیں۔ پہلی غلط فہمی یہ ہے کہ بہت سے لوگوں کے نزدیک دین کا مطلب صرف اتنا ہی ہے کہ آدمی چند عقائد مان لے یا کچھ ظاہری اعمال و رسومِ مذہبی کا پابند بن جائے اور بس۔ حالانکہ ہمارے نزدیک یہ دین کا

نہایت ناقص اور ادھورا تصوّر ہے، جو مختلف اسباب کے تحت اس وقت عمومیت کے ساتھ رائج و مقبول ہو گیا ہے۔ اس وقت ان اسباب کی تفصیلی توضیح کا تو موقع نہیں ہے، لیکن اگر کوئی شخص ان کی تحقیق کرنا چاہے تو ہم اشارۃً یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کو دین کی وسعتوں کے ان تنگنائیوں میں محدود ہو جانے کے اسباب چھٹی صدی ہجری میں مذہب و سیاست کے تصادم اور اس تصادم میں مذہب کی شکست، یورپ کے سیاسی غلبہ و تسلّط (جو اس نظریہ کے ساتھ دنیا پر قائم ہوا کہ مذہب زندگی کا ایک پرائیویٹ حصّہ ہے) اور علماء کی اپنے فرض سے غفلت یا سہل انگاری اور اُن کے فکری جمود میں تلاش کرنا چاہیے۔ بہر حال بہت سے لوگ جن میں مجھے یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ اس زمانے کے بہت سے مدعیانِ علم بھی شامل ہیں، دین کا مفہوم بس اتنا ہی سمجھتے ہیں کہ وہ روزہ، نماز، اور چند ظاہری چیزوں کے ادا یا اختیار کرنے کا نام ہے۔ حالانکہ دین ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو انسانی زندگی کے جملہ اجزا کو محیط ہے۔ اور اس کے اجزا میں باہم تفریق کرنا اور کسی جز کو آسان اور سہل یا مفید سمجھ کر اختیار کرنا اور دوسرے کو ترک کر دینا ایک بے دینی کی راہ ہے، جس سے ہمیں ہر طرح بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ قرآن مجید میں اہلِ کتاب کے ضمن میں فرمایا گیا ہے:

اَفَتُؤْ مِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ج فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ج ...الخ

(البقرۃ:۸۵)

”تو کیا تم کتاب الٰہی کے کچھ حصّہ پر ایمان رکھتے ہو اور کچھ حصّہ کا انکار کرتے ہو؟ سو یادرکھو تم میں سے جو لوگ یہ روش اختیار کریں گے اُن کی سزا اس کے سوا کچھ نہیں کہ دنیا کی زندگی میں بھی رسوا ہوں...الخ“

ایک اور موقعے پر مذمت کے انداز میں ارشاد ہوا ہے:

اَلَّذِيْنَ جَعَلُوا ج الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ○ (الحجر:۹۱)

”جنہوں نے اپنے قرآن کے ٹکڑے ٹکڑے بنا کر رکھ دیا ہے۔“

پھر قرآن نے صرف اس منفی پہلو ہی سے دین کے ٹکڑے کرنے سے نہیں روکا ہے بلکہ اس نے بے شمار آیتوں میں اثباتی طور سے ہمیں پورے قرآن اور احکامِ دین کی پابندی کی تاکید فرمائی ہے۔ قرآن ہر جگہ اللہ کی عبادت کی دعوت دیتا ہے، جس کا مفہوم محض پرستش یا پوجا نہیں ہے، بلکہ بندگی اور اطاعت تمام چیزیں اس کے مفہوم میں داخل ہیں، جیسا کہ قرآن کے استعمالات

سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔ قرآن اس عبادت کو صرف خدا کے لیے دیکھنا چاہتا ہے وہ اس میں کسی اور کی اطاعت کا شائبہ بھی نہیں آنے دینا چاہتا۔ اسی لیے وہ کہتا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝ (الانبیاء:۲۵)

''ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجا ہے اس کی طرف یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے لہٰذا میری عبادت کرو۔''

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ج لَآ اِلٰهَ اِلَّاهُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ۝ (التوبہ:۳۱)

''اور اُن کو کوئی حکم نہیں دیا گیا بجز اس کے کہ ایک ہی الٰہ کی عبادت کریں۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اور وہ پاک و برتر ہے اس شرک سے جو وہ کرتے ہیں۔''

عبادت کو خدا کے لیے مخصوص کرنے کی ہدایات کے ساتھ اس بات کو صراحتہً کہا گیا ہے کہ اس میں کسی اور کا حصّہ نہیں ہونا چاہیے۔ مثلاً:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوْا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوْا الطَّاغُوْتَ ج (النحل:۳۶)

''ہم نے ہر قوم میں ایک رسول اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی بندگی سے پرہیز کرو۔''

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ ج وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ج (التوبہ:۳۱)

''انہوں نے اپنے علماء و مشائخ کو خدا کے بجائے اپنا رب بنالیا اور اسی طرح مسیح ابن مریم کو بھی، حالانکہ ان کو ایک الٰہ کے سوا کسی کی عبادت کا حکم نہیں دیا گیا۔''

اسی طرح لفظ دین جس کے اصل مفہوم میں اطاعت شامل ہے اور اسی مناسبت سے وہ قرآن میں اس پورے نظامِ زندگی کے لیے استعمال کیا گیا ہے، جس کی بنیادی خصوصیت اللہ کی اطاعت ہے اس کے سلسلے میں بھی قرآن نے جابجا صراحت کی ہے کہ یہ ''خالص'' ہونی چاہیے۔ جس کا مطلب یہی ہے کہ اس اطاعت میں کسی اور کی شرکت کی گنجائش نہیں ہے:

قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ ۝ (الزمر:۱۱)

''اے نبی! کہہ دو مجھے تو حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کی بندگی کروں اسی کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے۔''

ایک دوسری جگہ فرمایا:

وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَّلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (یونس: ۱۰۴، ۱۰۵)

''اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ان لوگوں میں شامل ہو جاؤں جو اسی اللہ کے ماننے والے ہیں اور یہ ہدایت فرمائی گئی ہے کہ تو یکسو ہو کر اس دین کی طرف اپنا رُخ سیدھا کر لے اور شرک کرنے والوں میں شامل نہ ہو۔''

اسی طرح قرآن مجید نے مختلف آیات میں اپنے ماننے والوں کو پورے "مآاَنْزَلَ اللّٰہُ" کے اتباع کا اور بغیر کسی استثناء کے اپنی پوری زندگی کو خدا کی اطاعت کے حوالہ کر دینے کا صاف صاف حکم فرمایا ہے:

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۭ (الاعراف: ۳)

''لوگو! پیروی کرو ان باتوں کی جو تمہارے رب کی جانب سے تم پر نازل کی گئی ہیں اور اس کو چھوڑ کر دوسرے جھوٹے کارسازوں کے پیچھے نہ چلو۔''

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ (آل عمران: ۱۰۳)

''اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو اور گروہ گروہ نہ ہو جاؤ۔''

اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠ (البقرۃ: ۲۰۸)

''اللہ اور رسول کی اطاعت میں پوری طرح داخل ہو جاؤ۔''

ان ہی احکام کے تحت ہم مسلمانوں کو سب سے پہلے دعوت دیتے ہیں کہ وہ اہل کتاب کی طرح خواہشات و اہواء کا شکار نہ ہوں اور صرف اس بات پر تکیہ کر کے نہ بیٹھ رہیں کہ اگر وہ کسی مسلمان کے گھر اتفاق سے پیدا ہوئے ہیں اور کچھ مسلمانوں کے سے طور طریق انھوں نے رسم و رواج کے تحت اختیار کر لیے ہیں تو یہ مسلمان بننے اور اللہ کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے کافی ہے۔ اسی طرح ''امانی'' سے قرآن نے خود مسلمانوں کو خطاب کر کے ڈرایا ہے۔

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآاَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ط مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ لا (النساء:۱۲۳)

''مسلمانو! آخرت کی کامیابی نہ تمہاری آرزووں پر مبنی ہے نہ اہل کتاب کی آرزووں پر، جو کوئی برائی کرے گا اس کی سزا بھگتے گا۔''

اس کے بعد ہم اُن کو بتلاتے ہیں کہ اسلام کے لیے سب سے مقدم چیز یہ ہے کہ وہ اسلام و کفر کو سمجھیں تا کہ ایسا نہ ہو کہ وہ غلطی سے جو اختیار کرنے کی چیز ہے اُسے ترک و نظر انداز کر دیں اور جو نظر انداز کرنے کی چیز ہے اسے وہ اپنے سینوں سے چمٹائے رہیں۔

پھر ہم اُن کو بتلاتے ہیں کہ مجرد اسلام کے علم پر وہ اکتفا نہ کرلیں، بلکہ اس کے ساتھ وہ اپنے آپ کو عمل کے لیے بھی آمادہ کریں، جس کے بغیر بہ ہر حال ایمان اگر رہتا بھی ہے تو اُس کی حیثیت شجرِ بے ثمر سے زیادہ نہیں ہوتی۔

اس کے بعد ہم اُن کو بتاتے ہیں کہ عمل صرف نماز، روزہ اور حج وزکوٰۃ ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ جملہ اعمالِ انسانی اس میں داخل ہیں، خواہ وہ اخلاق و معاملات سے متعلق ہوں یا سیاسیات و معاشرت اور معیشت سے، اور حقیقی مومن وہی ہے جو اپنے جملہ معاملات زندگی میں احکامِ الٰہی کی اطاعت کرتا ہو۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَایُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَاجِئْتُ بِهٖ.

''قسم ہے اس ذات کی جس کی مٹھی میں میری جان ہے، تم میں سے کوئی اس وقت تک صحیح معنوں میں مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی خواہش نفس ہر معاملے میں میرے لائے ہوئے احکام کی پابند نہ ہوجائے۔''

آپ کے سامنے ایک عورت کا ذکر کیا گیا، جس کے بارے میں حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

فُلَانَةٌ تُذْکَرُ مِنْ کَثْرَةِ صَلٰوتِهَا وَصِیَامِهَا وَ صَدَقَتِهَا غَیْرَ اَنَّهَا تُؤْذِیْ جِیْرَانَها بِلِسَانِهَا.

''فلاں عورت کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ نماز بہت پڑھتی ہے اور روزہ بہت رکھتی ہے اور صدقہ بہت کرتی ہے مگر وہ اپنی زبان سے پڑوسیوں کو ایذا پہنچاتی ہے۔''

آپؐ نے فرمایا:

هِیَ فِی النَّارِ

"وہ دوزخی ہے۔"

اوراس کے مقابلے میں ایک دوسری عورت کا تذکرہ ہوا، جس کی صفت یہ تھی:

فُلاَ نَۃٌ تُذْکَرُ مِنْ قِلَّۃِ صِیَامِھَا وَ صَدَقَتِھَا وَ صَلٰوتِھَا وَاِنَّھَاتَصدق بِالْاَثْرَادَمِنَ الاقِطِ وَلَاتُوْذِیْ بِلِسَانِھَا جِیْرَانَھَا

"فلاں عورت کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ نفل روزے نفل صدقات اور نفل نمازیں کم ادا کرتی ہے۔ اور پنیر کے ٹکڑوں کا صدقہ کرتی ہے۔ مگر وہ اپنی زبان سے پڑوسیوں کو تکلیف نہیں پہنچاتی ہے۔"

آپؐ نے فرمایا:

هِیَ فِی الْجَنَّۃِ

"وہ جنتی ہے۔"

اسی طرح ایک موقعے پر آپؐ نے سوال فرمایا:

اَتَدْرُوْنَ مَنِ الْمُفْلِسُ؟

"جانتے ہو مفلس کون ہے؟"

لوگوں نے جواب دیا:

اَلْمُفْلِسُ فِیْنَا مَنْ لَّادِرْھَمَ لَہٗ وَلَادِیْنَارَ

"ہم میں مفلس (دیوالیہ) وہ ہے جس کے پاس روپے پیسے نہ ہوں۔"

آپؐ نے فرمایا، نہیں مفلس وہ نہیں ہے بلکہ:

اِنَّ الْمُفْلِسَ مِنْ اُمَّتِیْ مَن یَّاتِیْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ بِصَلوٰۃٍ وَصِیَامٍ وَزَکوٰۃٍ وَیَاتِیْ قَدْ شَتَمَ ھٰذاَ وَاَکَلَ مَال ھٰذَا وَسَفَکَ دَمَ ھٰذَا وَضَرَبَ ھٰذَا فَیُعْطٰی ھٰذا مِنْ حَسَنَاتِہٖ وَھٰذَامِنْ حَسَنَاتِہٖ فَاِنْ فُنِیتْ حَسَنَاتُہٗ قَبْلَ اَنْ یَقْضِیَ مَاعَلَیْہِ اُخِذَ مِنْ خَطَایا ھَمُ فَطُرِحَتْ عَلَیْہِ ثُمَّ طُرِحَ فِی النَّارِ.

"میری امت میں دیوالیہ وہ ہے جو قیامت کے دن نماز روزے اور زکوٰۃ کے ساتھ آئے

گا مگر اس نے کسی کو گالی دی ہوگی کسی پر بہتان لگایا ہوگا، کسی کا مال ہڑپ کیا ہوگا کسی کا خون بہایا ہوگا اور کسی کو مارا ہوگا تو اُن میں سے ہر ایک کو اس کی نیکیاں دی جائیں گی پس اگر لوگوں کے مطالبے پورے ہونے سے پہلے اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی تو اُن لوگوں کے گناہ اس کے اوپر ڈال دیے جائیں گے۔ اور اُسے دوزخ میں جھونک دیا جائے گا۔"

اسی طرح خود قرآن مجید کی آیتوں سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حقیقی مومن وہی ہے جو اپنے جملہ معاملات احکام شرع کے مطابق حل کرتا ہو۔

فَلَا وَرَبِّکَ لَایُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَایَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًاo (النساء: ٦٥)

"نہیں! تمہارا رب گواہ ہے یہ لوگ مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے تمام اخلاقی معاملات میں تم ہی کو اپنا حکم بنائیں، تمہارے دیے ہوئے فیصلے کے خلاف اپنے دلوں میں کوئی تنگی بھی نہ محسوس کریں اور اپنے آپ کو بالکلیہ حوالہ کر دیں۔"

ان آیات و احادیث کو دیکھتے ہوئے یہ ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کو کلی طور سے دین کو اختیار کرنے کی دعوت دیں اور اُن کی زندگیوں میں جہاں جہاں اس سے مطابقت نہیں پائی جاتی ہے اس پر خیر خواہی اور نصح کے ساتھ ان کی افہام و تفہیم کریں ہم جانتے ہیں کہ ہماری یہ بات لوگوں کے لیے خوشگوار نہیں ہو سکتی کیونکہ واقعتاً اپنے کو احکام الٰہی کا پابند بنانے کے لیے بہت کچھ خواہشات اور مفادات کو قربان کرنا ضروری ہے اور خاص طور سے ہماری یہ بات اُن لوگوں کے لیے تو بڑی ہی سخت اور ناگوار ہے جنہوں نے یہ بیڑا ہی اٹھالیا ہے کہ وہ مسلمانوں کو بشارت کی تھپکیاں دے دے کر سلاتے ہی رہے ہیں اور اُن کی بے عملی کے پردے میں اپنی بے عملیوں کو بھی چھپالے جائیں۔ لیکن اس کے باوجود ایسا کرنا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کیونکہ مسلمانوں کی نصح و خیر خواہی کے علاوہ ہمیں خود اپنی خیر خواہی بھی پیش نظر رکھنی ہے۔ اور ہم یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایک ضروری فریضہ ہے، جس سے غفلت دینی و دنیاوی دونوں طرح کے شدید نقصانات کی موجب ہے۔ پس ہم یہ کام لوگوں کی ناخوشی کے باوجود اپنی استطاعت کے بموجب کرنا چاہتے ہیں۔ اگر یہ کچھ لوگوں کے نزدیک خارجیت ہے تو یا تو ہمیں یہ بتایا جائے

کہ ہم نے قرآن وحدیث کے صحیح الفاظ سے جو کچھ سمجھا ہے وہ غلط ہے یا پھر یہ اقرار کیا جائے کہ وہ خارجیت ہے، جس کا اصل سرچشمہ خود قرآن وحدیث ہیں۔

ایسی صورت میں اس قسم کے اعتراضات کرنے والوں کو ہم پر لعن طعن کرنے کے بجائے خود اللہ اور اس کے رسول سے شکوہ کرنا چاہیے کہ انہوں نے دین کو اُن کے حسب منشا کیوں نہیں نازل کیا اور ''آمنّا'' کہنے کے بعد بھی ہمیں عمل وغیرہ کی سخت آزمائشوں میں کیوں ڈالا گیا؟

اسلام مکمّل ضابطۂ حیات ہے

خلاصہ یہ ہے کہ ہم اسلام کو ایک مکمّل ضابطۂ حیات سمجھتے ہیں۔ جس میں سیاست، معاشرت، معیشت، اخلاق ومعاملات اور بین الاقوامی تعلقات، غرض جملہ شعبہ ہائے زندگی کے بارے میں واضح ہدایات دی گئی ہیں۔ اور بحیثیت مسلمان ہمارے لیے ان ہدایات کی اتباع ضروری ہے۔ البتہ میں یہاں یہ وضاحت کردینا چاہتا ہوں کہ دین کو کلی طور سے اختیار کرنے کا مطلب ہمارے نزدیک بھی یہ نہیں ہے کہ اس میں مجبوریوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے، ہم بھی ''لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا'' کے قائل ہیں اور اسی بنا پر شخصی اور جماعتی بہت سی مجبوریوں کے تحت ہمارے نزدیک بھی احکام دین کے بہت سے اجزا ہمارے لیے قابل عمل نہیں ہیں۔ لیکن ہمیں اختلاف دو باتوں سے ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ اضطراری حالت کو واقعی حالت سمجھ لیا جائے اور اس اضطرار کو رفع کرنے کی کوشش نہ کی جائے اور دوسری بات یہ ہے کہ اضطرار سے یہ غلط فائدہ اٹھایا جائے کہ اس کی وجہ سے ہم خود دین میں تحریف کے مرتکب بنیں۔ یعنی کسی مجبوری کے تحت اگر کسی حکم شریعت کے ہم عملاً مکلّف نہ رہیں تو اس کی بناپر ہم اسے جائز سمجھ لیں کہ ہم احکام شریعت کو توڑ مروڑ کر اس شکل میں پیش کریں کہ گویا وہ اصلاً ایسے ہی ہیں۔ جان بوجھ کر دین کو غلط شکل میں پیش کرنا صرف خلق کو دھوکا دینا ہی نہیں ہے بلکہ یہ تحریف ہے جو شریعت میں بدترین معصیت ہے اور یہ یاد رکھیے کہ تحریف صرف اظہار وبیان کے الٹ پھیر ہی کا نام نہیں ہے بلکہ تحریف کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ ہم عمل سے دین کے مفہوم کو بدل دیں، اور یہ تحریف اُن لوگوں کے حق میں بہت ہی سخت اور گھناؤنی ہے، جن کے عمل کو لوگ اپنے لیے اسوہ بناتے ہوں۔ اس لیے ان کی ذمے داریاں اس معاملے میں سب سے زیادہ اور سخت ہیں۔

دین کی تخصیص مسلمانوں کے لیے

دوسری غلط فہمی جو دین کے سلسلے میں خود اسلام کے ماننے والوں میں بھی پائی جاتی ہے اور اُس کے نہ ماننے والوں میں بھی، وہ یہ ہے کہ وہ اسلام کو صرف مسلمانوں کا ایک قومی ورثہ سمجھتے ہیں۔ اس لیے مسلمان اسلام کو اس حیثیت سے پیش کرتے ہیں کہ یہ دوسرے ادیان و مذاہب کے مقابلے میں ایک حریف دین کی حیثیت رکھتا ہے اور دوسرے ادیان و مذاہب کے ماننے والے اس کو اس حیثیت سے دیکھتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کی کوئی مخصوص چیز ہے، جس سے اُن کا کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔ بلکہ چونکہ گوناگوں اسباب کے تحت ان کے مابین ایک عرصے سے قومی کشمکش چلی آرہی ہے اس لیے وہ اسلام کے ساتھ بھی بیگانگی اور نفرت کا برتاؤ کرتے ہیں حالانکہ ہم دین کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اگر وہ اس خدا کا اتارا ہوا دین ہے جو تمام دنیا کا خالق و مالک ہے تو یہ تو ہوسکتا ہے کہ جس زمانے میں وہ دین اترا ہے اس وقت کے حالات و موانع کی بنا پر اس نے اس دین کے ماننے والوں کو اس کا مکلّف نہ بنایا ہو کہ وہ اس کی تبلیغ دوسروں تک بھی کریں لیکن ایسا نہیں ہوسکتا ہے کہ اس نے اس کا دروازہ دوسروں کے لیے بند کردیا ہو اور کسی خاص قوم تک ہی اس کو محدود کردیا ہو اور اگر کسی دین کے بارے میں اس کے ماننے والوں کا یہ عقیدہ ہے تو ہمارے نزدیک یہ خود اس بات کی علامت ہے کہ یا تو وہ دین خدا کا بھیجا ہوا نہیں ہے یا پھر اس کے ماننے والوں نے بعد کو اس دین میں تحریفات کرکے اس کو قومیت کے رنگ میں رنگ لیا ہے اور اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ کوئی خدائی دین ایسا ہوسکتا ہے جو خاص حالات کی بنا پر کسی خاص قوم ہی کے لیے مخصوص رہا ہو تو یہ بات قطعاً ناممکن ہے، جس کا کسی حال میں تصور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ایک طرف تو خالقِ کائنات کا بھیجا ہوا دین ہو، جس نے تمام انسانوں کو پیدا کیا اور جس کی نگاہ میں سب انسان برابر ہیں اور دوسری طرف اس نے ایسے اصولوں کی تلقین کی ہو جو انسانوں، انسانوں اور قوموں، قوموں میں تفریق کے موجب بنیں۔

چنانچہ اسی بنا پر ہمیں اس کی بعض جماعتوں کی اس حالت پر انتہائی تعجب اور ساتھ ہی افسوس بھی ہوتا ہے کہ وہ نام تو دھرم اور مذہب کا لیتی ہیں لیکن اسی کے ساتھ انہوں نے اپنا اور اپنے دین کا رشتہ قومیت اور وطنیت کے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے۔ اور اِن جذبات میں وہ ان لوگوں سے

بھی آ گئے ہیں جو مذہب سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے اور قومیت اور وطنیت ہی ان کی نگاہ میں سب کچھ ہے۔ بہر حال ہر دین کے بارے میں ہمارا تصور یہی ہے کہ اگر وہ دین خدا کا ہے تو وہ انسانوں، انسانوں میں کسی تفریق کا قائل نہیں ہوسکتا کہ وہ اپنے کو کسی خاص نسل ونسب یا خطّے سے تعلّق رکھنے والوں کے لیے تو خاص کردے اور اُن کے باہر کے لوگوں پر اپنا دروازہ بند کردے اور خاص طور سے اسلام کے بارے میں تو ہم پورے وثوق اور جزم کے ساتھ کہتے ہیں کہ اس کا مخصوص طور سے کسی قوم کے ساتھ لگاؤ نہیں ہے، وہ ہر قوم کا اپنا دین ہے بلکہ پوری کائنات کا دین ہے۔

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ۝ (ال عمران:۸۳)

”تو کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں حالانکہ جتنی چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں سب چار وناچار اسی کی مطیع ہیں اور اسی کی طرف اُنہیں پلٹ کر جانا ہے۔“

خود قرآن نے اس کی صراحت کی ہے کہ تمام بنی نوع انسان کا دین ہمیشہ ایک ہی رہا ہے اور اسی کی طرف تمام انبیاء نے جو ہر دور میں اور ہر قوم میں آئے تھے، دعوت دی تھی البتہ جب انسانوں میں بگاڑ پیدا ہوا اور وہ دین کے بجائے اپنے اہوا واغراض کی پیروی کرنے لگے تو اس وقت وہ مختلف ملتوں اور گروہوں میں تقسیم ہوگئے:

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً قف فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ص وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ط (البقرۃ:۲۱۳)

”سارے انسان بہ اعتبار اصل وحقیقت ایک ہی امت ہیں (لیکن وہ پھر باہم اختلاف کرنے لگے تو) اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو بھیجا جو بشارت دینے والے اور اختلاف کے انجام سے ڈرانے والے تھے اور اُن کے ساتھ کتاب اتاری حق کے ساتھ تاکہ وہ کتاب لوگوں کے درمیان ان کے اختلافات کا فیصلہ کرے۔“

اسی بنا پر قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنا سب سے پہلا خطاب يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ ”اے انسانو! اپنے رب کی بندگی کرو۔“ سے شروع کیا ہے اور اگر وہ کفر وایمان کی بنا پر کوئی خصوصی طرز خطاب اختیار بھی کرتا ہے تو اس کی بنیاد صفات پر ہوتی ہے نہ کہ کسی قومیت، نسل ونسب

اور رنگ وغیرہ پر۔ قومیت کے بنیادی اجزا یہی چیزیں ہیں لیکن قرآن اُن میں سے کسی چیز کو بھی کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ مثلاً وہ زبان اور رنگ کے اختلاف کو اس حیثیت سے پیش کرتا ہے کہ یہ اس کی قدرت کی نشانی ہے نہ اس حیثیت سے کہ وہ بجائے خود انسانوں میں فرق و امتیاز کی کوئی چیز ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ؕ (الروم:۲۲)

''اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش، اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے۔''

وہ نسل ونسب کے اختلاف کو بھی کوئی حیثیت نہیں دیتا، اس کے نزدیک سب انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔ اور سب کا خالق ایک ہے۔ اس لیے وہ سب اس حیثیت سے یکساں درجہ رکھتے ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ (النساء:۱)

''اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اس کی جنس سے اس کا جوڑا بھی بنایا اور پھر اُن دونوں سے بے شمار مرد اور عورت پھیلا دیے۔''

اس کی نگاہ میں مختلف قوموں اور قبیلوں کی بھی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے بلکہ یہ اختلاف محض اُن کے باہمی تعارف کا ذریعہ ہے۔ اصلی فرق و امتیاز جو انسانوں میں قائم ہوسکتا ہے اس کی بنیاد محض تقویٰ اور خدا ترسی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ (الحجرات:۱۳)

''اے انسانو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور ہم نے تم کو خاندانوں اور قبیلوں کی شکل میں بنایا تا کہ ایک دوسرے کو جاننے پہچاننے کی آسانی ہو بلاشبہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہی ہے جو تم میں سب سے زیادہ خدا ترس ہوگا۔''

خود رسول اللہ ﷺ نے اپنے آخری خطبۂ حج میں ارشاد فرمایا تھا:

لَافَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ وَلَا بِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ كُلُّكُمْ بَنُوْ آدَمَ وَ آدَمُ مِنْ تُرَابٍ (او کماقال).

''نہ کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت ہے نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر۔ تم سب کے سب آدم کے بیٹے ہو اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے تھے۔''

پس جب اسلام کے نزدیک قومیت کے یہ اجزا زبان و رنگ اور نسل و نسب کوئی بنیادی حیثیت نہیں رکھتے تو وہ اپنے کو کس طرح خاص قوم سے مخصوص کرسکتا تھا۔

خدا کسی خاص خاندان یا قوم سے کوئی مخصوص لگاؤ نہیں رکھتا وہ سب کا خدا ہے خواہ کوئی گورا ہو یا کالا، عربی ہو یا ہندی، افریقی ہو یا مغربی، مالدار ہو یا غریب، وہ رب المسلمین نہیں ہے، بلکہ رب العالمین ہے اور اس کے آخری رسول جس کے ذریعے دین کی تکمیل کی گئی ہے، وہ مخصوص طور سے مسلمانوں کے لیے نہیں بھیجے گئے تھے۔ خود قرآن کہتا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ○ (الانبیاء:۱۰۷)

''اے نبی! ہم نے نہیں بھیجا ہے تم کو مگر سارے جہان کے لیے رحمت بنا کر۔''

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (سبا:۲۸)

''اور (اے نبی) بالیقین ہم نے تمھیں تمام انسانوں کے لیے خوش خبری کا پیام سُنانے والا اور ڈراوا دینے والا بنا کر بھیجا ہے۔''

اور یہی حیثیت قرآن کی بھی ہے:

تَبٰرَكَ الَّذِىْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا○ (الفرقان:۱)

''بڑی بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر حق و باطل کے درمیان واضح فرق کردینے والی کتاب نازل کی تاکہ وہ پوری دنیا کے لیے خبردار کردینے والی ہو۔''

اور یہ قرآن پچھلی کتابوں اور پچھلے نبیوں کا مصدق ہے نہ کہ اُن کا مکذّب:

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (البقرۃ:۹۷)

''یہ قرآن اپنے پہلے آنے والی کتابوں کا تصدیق کرنے والا ہے۔''

پھر ان تصریحات سے قطع نظر اگر محض لفظ اسلام کی حقیقت پر غور کیا جائے جو بدقسمتی

سے صرف مسلمانوں کا دین سمجھ لیا گیا ہے تو یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ یہ ایک عالمی دین ہے، جو کسی خاص قوم کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ اسلام کے معنی اپنے کو خدا کے حوالہ کر دینے کے ہیں اور وہ شخص مسلم ہے جو اس حوالگی پر آمادہ ہو جائے خواہ وہ حبشہ کے بلال ہوں یا روم کے صہیب رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

غرض یہ ہے کہ ہم جس دین کا نام لیتے ہیں اور جس کو قائم کرنے کی آرزوئیں لے کر اٹھے ہیں۔ وہ ہمارا کوئی قومی مذہب نہیں ہے بلکہ وہ تمام قوموں کا اور پوری کائنات کا مذہب ہے اور اس دین کی بنیاد قومیت کے اجزا میں سے کسی جز پر قائم نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد وہ اصول ہیں، جن کی تبلیغ ہر آسمانی کتاب میں کی گئی ہے۔ یعنی خدا پرستی، رسالت اور جزا و سزا کا عقیدہ، اس لیے جب ہم اقامتِ دین کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے ہماری مراد کسی ایسے دین و مذہب سے نہیں ہوتی، جس کا رشتہ کسی خاص قوم سے جڑا ہوا ہو بلکہ اصولوں سے ہوتی ہے جو قومیت سے بالاتر ہیں اور جو ہر انسان کی فطرت میں ودیعت کیے گئے ہیں اور جو ہر انسان اور ہر قوم کے لیے جو اُن کو اپنائے یکساں طور سے مفید ہیں۔

تحریکِ اسلامی کے بنیادی اُصول

دین کے بارے میں ان دو بنیادی غلط فہمیوں کے دور ہو جانے کے بعد آیئے اب اس مسئلے پر غور کریں کہ جو تحریک دین کے اس مفہوم کے ساتھ اس کو قائم کرنے کے لیے کھڑی ہوئی ہو اس کے لیے کیا اصول صحیح ہو سکتے ہیں۔ اور اس تحریک کے لیے کام کرنے والوں میں کیا باتیں ناگزیر طور سے ہونا چاہئیں۔ مجھے توقع ہے کہ اس کے بعد ہمارے بارے میں وہ بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی جو ناواقفیت کی بنا پر بہت سے لوگوں کو پیش آتی ہیں۔

پہلا اصول

پہلا اصول اس طرح کی تحریک کے لیے یہ ہونا چاہیے کہ وہ دین کو اس کی اصل شکل میں قائم کرنے کی کوشش کرے۔ نہ اس میں اپنی طرف سے کسی بات کا اضافہ کرے اور نہ اس میں کسی طرح کی کمی کرے۔ کیونکہ اضافہ اور کمی کا مطلب یہ ہوگا کہ دین اپنی اصل شکل میں باقی نہیں رہا اور ہم نے خود اپنے لیے ایک نیا دین ایجاد کر لیا۔ یہ دونوں باتیں گمراہی کی باتیں ہیں خواہ وہ بظاہر کسی دینی جذبے ہی کے ماتحت کیوں نہ عمل میں آئیں۔ یہود و نصاریٰ کی اصل گمراہی اسی طرح کی افراط و تفریط کا نتیجہ تھی۔ اسی بنا پر آنحضرت ﷺ نے بڑی شدت کے ساتھ نئی بات پیدا کرنے سے روکا ہے۔

مَنْ اَحْدَثَ فِیْ دِیْنِنَا مَالَیْسَ فِیْهِ فَهُوَ رَدٌّ.

”جس نے ہمارے دین میں کوئی ایسی بات پیدا کی جو اُس کے اندر موجود نہیں ہے اس کی یہ بات ناقابلِ قبول ہے۔“

كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ.

''دین میں بڑھائی ہوئی ہر چیز گمراہی ہے اور ہر گمراہی کا ٹھکانہ جہنم ہے۔''

اور اسی بنا پر کسی ترک شدہ سنت کو دوبارہ زندہ کرنے کا ثواب بہت سی راتوں کی نمازوں سے بھی زیادہ قرار دیا گیا ہے۔

اور اس کمی و بیشی کی تحقیق کے لیے ہمارے پاس مستندترین چیز کتاب وسنّت ہیں، جن کے بارے میں آپ نے فرمایا:

تَرَکْتُ فِیْکُمْ اَمْرَیْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَاتَمَسَّکْتُمْ بِھِمَا کِتَابُ اللّٰہِ وَ سُنَّۃُ رَسُوْلِہٖ.

''مسلمانو! تمہارے اندر دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں جب تک تم ان کو مضبوطی سے تھامے رہو گے ہر گز گمراہ نہ ہو گے۔ اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنّت۔''

جو چیز اس کے مطابق ہو وہ اپنی جگہ صحیح ہے اور جو نہ ہو وہ قابل ردّ ہے۔ یہاں تک کہ اجماع و قیاس کے معتبر ہونے کے لیے بھی یہ شرط ہے کہ وہ کتاب وسنت کے مطابق ہوں ورنہ اُن کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

دوسرا اُصول

دوسرا اُصول اس تحریک کے لیے یہ ہونا چاہیے کہ وہ دین کے پورے مجموعے کو جو اس کے مستند ذرائع علم سے ثابت ہوا اپنے سامنے رکھے نہ کہ اس کے کسی خاص جز کو۔ بالفاظ دیگر اس کی جدوجہد کا منشاء یہ ہونا چاہیے کہ پورا دین اپنی مجموعی اور کلی شکل میں قائم ہو نہ یہ کہ وہ اس مجموعہ میں سے کچھ خاص خاص باتوں کو چھانٹ لے اور پھر اُن ہی باتوں پر اپنی سعی و عمل کو مرکوز کر دے۔ اس طرح کے طرز عمل کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوگا کہ دین اپنی اصل شکل میں قائم نہ رہے بلکہ یہ زبردست فتنوں کا موجب بھی ہو سکتا ہے کیونکہ خاص خاص حالات میں اس سے اس بات کا بجا طور سے اندیشہ ہو سکتا ہے کہ جن اجزا کو چھوڑ دیا جائے وہ رفتہ رفتہ دین کی وسعتوں سے خارج ہو جائیں اور اس طرح دین کا مفہوم محدود ہو کر رہ جائے۔ اس لیے ہمارے خیال کے مطابق صحیح طریقۂ کار یہی ہو سکتا ہے کہ کل دین کو اپنا کر چلنے کی کوشش کی جائے اور اگر مشکلات و موانع کی وجہ سے ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو کم از کم اتنی بات تو ضرور ہونی چاہیے کہ بیان و اظہار کی حد تک ہم پورے دین کی وضاحت کرتے رہیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ ہمارا یہ مجبورانہ طرز عمل آگے چل کر دین کا اصلی طرز عمل بن

جائے۔ اور لوگ یا تو مجبوریوں کے بغیر بھی اس کو اختیار کرنے لگیں یا ان مجبوریوں پر قانع ہو جائیں اور ان کو بدلنے کے لیے کوئی کوشش نہ کرسکیں جیسا کہ ہماری پچھلی تاریخ گواہ ہے کہ بہت سی چیزیں محض اضطرار کے عذر کی بنا پر جائز کرلی گئیں۔ لیکن آج وہ شریعت کا مستقل جز بن گئی ہیں۔ اس حد تک کہ آج ان کے بارے میں شریعت کی صحیح رائے بیان کرنے کی لوگوں کو جرأت نہیں ہوتی۔ اور اگر کوئی جرأت کر کے ان کے خلاف لب کشائی کرتا ہے تو لوگوں کو اس کی باتوں پر تعجب ہوتا ہے۔ اور بہت سے لوگ تو ایسے شخص کو خارج از ملّت وغیرہ کا بھی خطاب دینے لگتے ہیں۔ اس خطرہ کے پیش نظر اگر عمل سے نہیں تو کم از کم زبان سے تو دین کی صحیح تعبیر اس وقت تک کرتے رہنا چاہیے جب تک زبان میں یارا ہے۔ تاکہ اگر ہمیں پورے دین پر عمل کی توفیق حاصل نہ ہو سکے تو اس کا تصور تو زندہ رہ سکے۔ ممکن ہے اس کی بدولت ہمارے بعد آنے والے اس پر عمل کی توفیق پاسکیں ورنہ اندیشہ ہے کہ ہمارا طرزِ عمل دین کے اصلی تصور کو ذہنوں سے بھی ختم کردے اور اس سے بڑی بدقسمتی کی بات اور کیا ہوسکتی ہے؟

بہر حال جو لوگ دین کو قائم کرنا چاہتے ہیں ان کے سامنے عزیمت کی یہی راہ ہونی چاہیے باقی رہے وہ لوگ جو اپنے اندر صرف اتنا ہی حوصلہ پاتے ہیں کہ وہ کل دین کے بجائے اس کے خاص خاص اجزا کو قائم یا بیان کرنے کی کوشش کریں تو اگر وہ اس سے زیادہ کے لیے واقعی اپنے کو مجبور پاتے ہیں اور ساتھ ہی اُن کا تصور یہ نہیں ہے کہ وہ جو کچھ کر پا رہے ہیں وہ کل دین ہے بلکہ اس کے ساتھ وہ پورے دین کے تصور کو اپنی جگہ صحیح اور اس کے قیام کی ضرورت کے بھی قائل ہیں تو ایسے لوگ اپنی جگہ معذور سمجھے جاسکتے ہیں اور وہ جو کچھ کام کر رہے ہوں وہ اس کام میں پوری ہمت افزائی کے مستحق ہیں کیونکہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ بہر حال دین ہی کا اک شعبہ ہے اور اگر وہ شعبہ ان کی کوششوں سے اپنی جگہ درست ہو جاتا ہے تو یہ پورے دین کی کوشش کا ایک جز ہوگا اور اس سے بہر حال دین کے قیام میں سہولت اور مدد حاصل ہوگی۔

تیسرا اُصول

تیسرا اُصول اس تحریک کا یہ ہونا چاہیے کہ اُس میں جس طرح اس بات کا لحاظ ضروری ہے کہ دین میں کوئی کمی وبیشی نہ ہو اور اس کا پورا مجموعہ سامنے رکھا جائے نہ کہ اس کے کسی خاص جز کو، اسی

طرح اس بات کا بھی لحاظ کیا جائے کہ دین کے مجموعے میں، جس چیز کو جس قدر کم یا زیادہ اہمیت حاصل ہے اس کو پوری شدت کے ساتھ برقرار رکھا جائے اس میں کسی طرح کا ردو بدل نہ ہونے دیا جائے۔ کیونکہ اہمیت کے لحاظ سے کمی و بیشی بھی دین میں تحریف ہی کا ہم معنٰی ہے۔ تحریف صرف یہی نہیں ہے کہ ہم شریعت کے کسی حکم کو بدل دیں بلکہ یہ بھی تحریف ہی کی ایک قسم ہے کہ شریعت میں جس چیز کا اہمیت کے لحاظ سے جو مقام ہے اس میں ہم اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کریں۔ چنانچہ اسی بنا پر حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے اپنے والد بزرگوار شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے متعلق تحریر فرمایا ہے کہ ''وہ فرمایا کرتے تھے کہ سنت کے بارے میں یہ عقیدہ کرا دینا کہ یہ فرض ہے، شریعت میں ایک طرح کی تحریف ہے۔''

دین میں ردّو بدل کے نتائج

اور ہر تحریف کی طرح اس قسم کی تحریف سے بھی بڑے بڑے فتنے پیدا ہوتے ہیں علاوہ اس بات کے کہ دین کا اصلی مزاج جو اللہ اور رسول کے ہر حکم کو اپنی جگہ رکھنے سے پیدا ہوتا ہے اس عمل سے اس مزاج میں فرق واقع ہو جاتا ہے اس کے تین نقصانات بہت زبردست ہیں۔ ایک نقصان یہ کہ اس طرح بعض غیر اہم چیزوں پر اُن کی اہمیت سے زیادہ زور دینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اہم چیزوں کی اہمیت نگاہوں میں کم ہو جاتی ہے اور غیر اہم زیادہ اہم بن جاتی ہیں۔ چنانچہ یہ اسی چیز کا نتیجہ ہے کہ بہت سے لوگوں کی نگاہوں میں بعض جزئی مسائل کی تو اتنی اہمیت ہوگئی ہے کہ ان کی بنا پر لوگوں کی مسجدیں اور اُن کی نمازیں الگ الگ ہوگئی ہیں لیکن بہت سی واقعی اہم باتوں کے سلسلے میں اُن میں سے کسی کو بھی کچھ زیادہ پروا نہیں ہے۔ گویا مچھر کو تو چھانا جاتا ہے لیکن اونٹ کے نگلنے میں حرج محسوس نہیں ہوتا۔ دوسرا نقصان یہ ہے کہ امت میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر بے شمار تفریقیں قائم ہوگئی ہیں۔ اور اُن میں باہم ایک عرصے سے جنگ و جدال برپا ہے۔ اور یہ اس صورت حال کا بالکل قدرتی نتیجہ ہے کیونکہ اس طرح کی جزئی باتوں پر جن کو اپنی طرف سے زیادہ اہم بنا دیا گیا ہو۔ تمام اُمّت کا متفق ہونا بہت دشوار ہے۔

اور تیسرا نقصان یہ ہے کہ یہ طرزِ عمل بہت سے لوگوں کے لیے خود دین سے تنفّر کا باعث بن رہا ہے کیونکہ جب غیر اہم اور جزئی باتوں پر زیادہ زور صرف کیا جانے لگے گا۔ یا اُن کو اس

سے زیادہ اہمیت دے دی جائے گی جو اصل شریعت میں ہوگی۔ تو قدرتی طور سے اسی طرح کی باتیں نمایاں ہوں گی اور شریعت کے اہم اجزا نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں گے۔ اس طرح دین کا اصلی روپ نکھر کر سامنے نہیں آسکے گا اور اس میں جو کچھ حسن و جمال ہے وہ نگاہوں سے پوشیدہ ہو جائے گا۔ آج حالت یہ ہو رہی ہے کہ خود مسلمانوں کا پڑھا لکھا طبقہ باطل نظریات کا شکار ہو کر اسلام کی بنیادی باتوں سے منحرف ہوتا جا رہا ہے، لیکن ہمارے بہت سے علماء کو فکر ہے تو اس بات کی کہ لوگ استنجاء اور وضو وغیرہ کی فلاں فلاں مستحبات ترک کرتے جا رہے ہیں۔ تو کیا اسی طرح کی باتوں سے اس طبقے کے لوگوں کو اسلام کا گرویدہ بنایا جا سکتا ہے؟ حاشا، میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ میں اِن مستحبات کا استخفاف کروں۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کا مقصد یہ ہے کہ شریعت کی ہر چیز موزوں جگہ پر بالکل ٹھیک طور سے نصب کی گئی ہے اور اسی کے اعتبار سے ان کا درجہ قائم کیا گیا ہے۔ اگر یہ موزونیت اپنی جگہ باقی نہیں رہے گی تو دین کی اصلی حقیقت بھی برقرار نہیں رہ سکے گی۔ اور اس طرح وہ اپنی جاذبیت بھی بہت کچھ کھو دے گا۔ بلکہ ہوسکتا ہے کہ ہم اپنے اس طرزِ عمل سے دین کا کوئی ایسا نقشہ لوگوں کے سامنے پیش کر دیں، جسے دیکھ کر وہ اس کی طرف بڑھنے کی بجائے اس سے اور دور بھاگنے لگیں اور اس کی تمام تر ذمے داری ہم پر ہوگی۔ کیونکہ دین تو اپنی اصلی ہیئت میں سرتاپا حسن و جمال ہے، جس کی طرف ہر سلیم الفطرت بڑھنے پر مجبور ہے۔ لیکن یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب شریعت اپنی اصلی شکل میں باقی رکھی جائے۔ اور اپنے تصرفات کے ذریعے اس کی صورت و ہیئت میں کسی طرح کی تبدیلی نہ کی جائے۔

چوتھا اصول

چوتھی چیز جو اس تحریک کے لیے ضروری ہے وہ یہ کہ جس طرح ہم اس کے اجزا میں ان کی اہمیت کے اعتبار سے کوئی ردّوبدل نہ کریں۔ اسی طرح ان اجزا میں جو تقدیم و تاخیر یا ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے اس میں بھی کسی طرح کا فرق واقع نہ ہونے دیں، ورنہ اس کا نتیجہ بھی یہی ہوگا کہ شریعت کا صحیح ڈھانچہ اپنی شکل میں برقرار نہیں رہ سکے گا۔ مثال کے طور پر شریعت میں سب سے مقدم چیز عقائد ہیں، جن پر تمام احکام و اعمال کی دیوار کھڑی ہوتی ہے۔ اگر عقائد کو ان کی جگہ سے ہٹا دیا جائے تو اس کے بعد اعمال کی جو عمارت تعمیر ہوگی وہ کوئی صحیح شرعی عمارت نہیں ہوگی یا مثلاً اسلام کا جو

اقتصادی یا معاشی نظام ہے وہ اپنے آگے پیچھے عقائد واعمال کا ایک پورا سلسلہ رکھتا ہے۔ اگر کوئی اس نظام کو اس کی اصلی جگہ سے ہٹا کر اپنانے کی کوشش کرے تو وہ اپنی ظاہری ہیئت کے لحاظ سے ممکن ہے اسلامی کہا جا سکے۔ لیکن وہ حقیقتاً اس کا مستحق نہیں ہوگا۔ اور نہ اس سے وہ خیر وبرکات ظاہر ہو سکیں گی، جن کی توقع صحیح اسلامی نظام معاشرت سے بجا طور سے وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

پانچواں اصول

پانچواں اصول جس کا اس طرح کی تحریک میں لحاظ رکھنا ضروری ہے، یہ ہے کہ اس کو ہر طرح کی قومی اور وطنی تعصّبات اور دلچسپیوں سے بالکل پاک رکھنا چاہیے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے کہ اسلام ایک دین یعنی ضابطۂ حیات ہے، جس کی بنیاد فطری اصولوں پر قائم ہے۔ اور ان اصولوں کا کوئی تعلق قومیت اور وطنیت سے نہیں ہے۔ لیکن یہ عجیب بدقسمتی ہے کہ مسلمانوں نے ایک عرصے سے اپنی حیثیت کو خلط ملط کر دیا ہے۔ کبھی تو وہ اصولی جماعت بن کر اپنے مسائل پر غور کرتے ہیں اور کبھی محض ایک قوم بن کر رہ جاتے ہیں۔ ان دو مختلف حیثیتوں میں مبتلا ہونے کی وجہ سے دین و دنیا دونوں حیثیتوں سے نقصان اٹھا رہے ہیں۔ اس دورُخی پالیسی سے دین کا حسبِ مراد حاصل ہونا تو دشوار ہے ہی دنیا بھی حاصل نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ دنیا کی اور قوموں کی طرح ایک قوم بن جائیں اور بالکل قومی انداز میں اپنے مسائل پر غور وفکر کریں اور اُن کا حل پیدا کریں۔ لیکن جس وقت وہ قومی بنیادوں پر مسائل کو سوچ رہے ہوتے ہیں اور حل کر رہے ہوتے ہیں۔ یکا یک اُنہیں درمیان ہی میں اپنی دینی حیثیت کا احساس ستانے لگتا ہے۔ اور وہ اس کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگتے ہیں۔ اس طرح اُن کا حال اس شخص کا سا ہو جاتا ہے جو بیک وقت دو کشتیوں پر سوار ہو۔ بہر حال اصل حیثیت مسلمانوں کی یہی ہے اور یہی ہونی چاہیے کہ وہ خالص اصولی جماعت بن جائیں، جس کو قوم اور وطن وغیرہ کی غیر فطری حد بندیوں سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ بلکہ اپنے عالمگیر اصولوں کی طرح وہ عالمگیر پارٹی کی حیثیت اختیار کریں۔ قوم اور ملک کے ساتھ ایک مسلمان کو فطری حد تک ضرور تعلق ہوسکتا ہے اور اسلام اس کا منکر نہیں ہے کیونکہ وہ ایک دینِ فطرت ہے اور اس فطری تعلق کے جو تقاضے ہیں اُن کو پورا کرنے میں بھی وہ کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتا بلکہ وہ خود اُن کی ادائیگی کا محرّک ہے لیکن ان حدود سے آگے قوم پرستی یا وطن پرستی کی یہ حد کہ

وہ ان کے لیے اپنے اصولوں کو ترک کر دے اور اپنے صحیح مسلم ہونے کی حیثیت اور اس کے تقاضوں کو نظر انداز کر دے۔ اسلام اس کا کسی حال میں روادار نہیں ہوسکتا۔ یہ پرستاریاں خدا پرستی کے بالکل منافی ہیں اور ہمارے خیال کے مطابق یہ شیطان کی پھیلائی ہوئی لعنتوں میں سے دو بڑی لعنتیں ہیں، جن میں اس وقت دنیا کی قومیں مبتلا ہیں اور جنہوں نے ان کے دین واخلاق کے ساتھ ان کی دنیا کو نجات نہیں مل سکی ہے۔ وہ انہیں لعنتوں کا براہ راست نتیجہ رہی ہیں اور تیسری جنگ جس کے بادل سروں پر منڈلا رہے ہیں اس کا باعث بھی یہی لعنتیں ہیں۔

جماعت اسلامی کے اصول کیا ہیں؟

یہ ہیں وہ اصول جو ہمارے نزدیک اقامتِ دین کی تحریک کے لیے ضروری ہیں۔ اب میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ہم اپنی استطاعت کے مطابق اِن ہی اصولوں کو لے کر چلنا چاہتے ہیں۔

(۱) دین میں نہ ہم کوئی کمی بیشی کرنا چاہتے ہیں اور نہ ہم نے کی ہے۔ ہم کتاب وسنت کو اپنے ہر کام اور ہر قول کا اصل ماخذ مانتے ہیں اور اپنی سمجھ کے مطابق ہم نے اپنی ہر چیز اُن ہی سے حاصل کی ہے۔ اگر کسی کے نزدیک ہماری کوئی چیز اس معیار کے خلاف ہو تو ہم اس کے لیے ہر وقت آمادہ ہیں کہ وہ ہمیں اس پر متنبّہ کرے۔ انشاءاللہ ہم اس کو ایک لمحہ کے تردّد کے بغیر تسلیم کرلیں گے۔ اور ایسے شخص کے شکر گزار ہوں گے، لیکن اس موقعے پر میں یہ عرض کیے بغیر نہیں رہوں گا کہ ہماری کسی چیز پر اعتراض دلیل کی بنا پر ہونا چاہیے۔ محض یہ بات کہ لوگ ایسا کہتے یا کرتے رہے ہیں۔ ہمارے نزدیک کوئی دلیل نہیں ہے۔

(۲) ہم کل دین کو لے کر چلنا چاہتے ہیں۔ اس لیے ہم ان کوششوں کو سراہ ضرور سکتے ہیں جو دین کے کسی جز کی اصلاح وتعمیر کے سلسلے میں بروئے کار لائی جارہی ہوں۔ لیکن ہم اپنی کوششوں کو ان میں محدود نہیں کر سکتے۔

(۳) ہم دین کو اس کی اصل شکل میں قائم کرنے کے خواہشمند ہیں اس لیے ہم اس بات کے روادار نہیں ہو سکتے کہ اجزا دین میں جو ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے اس میں کوئی فرق آنے دیں یا اہمیت کے اعتبار سے اس کا جو مقام تجویز کیا گیا ہے اس میں اپنی طرف

سے کوئی ردّوبدل کریں۔ اس لیے ہم میں سے کسی کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ ہم مثلاً آمین اور رفع یدین یا تقلید اور عدم تقلید وغیرہ کے ان مسائل میں اپنے کو الجھائیں گے، جن پر آج اُمت میں بڑے بڑے معرکے قائم ہیں۔ اس طرح کی بحثیں ہمارے لیے خارج از بحث ہیں۔ ہم فروع کے بجائے اصل اسلام کے داعی ہیں۔ اس لیے ہمارے یہاں ان بحثوں کی گنجائش نہیں ہے۔ کوئی حنفی ہو یا شافعی، مقلّد ہو یا غیر مقلّد، صوفی ہو یا غیر صوفی، اگر وہ اسلام کو بنیاد بنا کر اس کو کلی شکل میں قائم کرنے کی تحریک میں حصّہ لینا چاہتا ہے تو وہ ہمارا ساتھی بن سکتا ہے۔ اس طرح کی چھوٹی باتوں کی بنا پر، جن کے بارے میں دین میں بہر حال گنجائش ہے۔ ہم اپنا دروازہ کسی کے لیے بند نہیں کرنا چاہتے اور نہ اس طرح کی بحثوں میں دل چسپی لینا ہم اپنے اصول کے لحاظ سے مناسب سمجھتے ہیں۔

(۴) ہم قوم پرستی اور وطن پرستی سے بھی اپنے کو بالاتر رکھنا چاہتے ہیں اس لیے نہیں کہ ہمیں قوم یا وطن سے نفرت ہے۔ نفرت کیا معنی حقیقتاً ہمیں ان سے حقیقی اُنس و محبت ہے، جس وطن میں ہم پیدا ہوئے اور جس کی آب و گل سے ہمارا ڈھانچہ بنا اور جس قوم میں ہماری پیدائش ہوئی اور جس سے ہم نے طرح طرح کے فائدے اٹھائے، ان کے حقوق کو ہم کسی حال میں نظر انداز نہیں کر سکتے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے جس کو ہم چھپانا نہیں چاہتے کہ ہمیں اپنی قوم اس اعتبار سے بہت زیادہ عزیز ہے کہ ہم جن اصولوں کو لے کر کھڑے ہوئے ہیں وہ انہیں اصولوں کی نام لیوا ہے اور اُن کی اصلاح ہمارے اصولوں کی ترقی کا بہت بڑا اور مؤثر ذریعہ بن سکتی ہے اس لیے ہم اُن سے نفرت کس طرح کر سکتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ہم اپنے کو قوم پرستی اور وطن پرستی سے بالاتر رکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ یہ پرستاریاں ہمارے اصول کے خلاف ہیں اور ہمارے نزدیک قوم و وطن دونوں کا حقیقی فائدہ اسی میں ہے کہ ہم ان کو اپنے خدا پرستانہ اصولوں پر چلنے کی دعوت دیں جس کی حیثیت ہماری نگاہ میں یہ ہے کہ قوم اور ملک کے حقیقی مفاد و مصالح اُن سے ٹکراتے نہیں ہیں بلکہ یہ اصول ان کو اور زیادہ پورا کرنے والے ہیں۔ چنانچہ اسی بنا پر ہم نے اب تک اپنے کو قومی اور وطنی تعصبات سے ہر طرح علیحدہ رکھنے

کی کوشش کی ہے۔ جماعت کی تشکیل کا زمانہ عین وہ زمانہ ہے جب ملک میں اس طرح کی تحریکیں اپنے شباب پر تھیں۔ ایک طرف استخلاصِ وطن کی جدوجہد جاری تھی۔ اور دوسری طرف قومی حقوق کے تحفظ کی۔ لیکن ہم نے ان سے اپنے کو جان بوجھ کر الگ رکھا۔ اگرچہ اس کے نتیجے میں ہمیں طرح طرح کی مخالفتوں اور طعن و تشنیع سے دوچار ہونا پڑا کیونکہ یہ تحریکات کلی طور سے ہمارے اصولوں سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔ ہمارے نزدیک آزادی صرف یہ نہیں ہے کہ ایک قوم کے افراد دوسری قوم کی غلامی سے نجات پا جائیں بلکہ اصلی آزادی یہ ہے کہ ایک طرف وہ اپنے ہی جیسے انسانوں اور خود اپنے نفس کی غلامی سے آزاد ہو جائیں۔ اور دوسری طرف وہ اپنے حقیقی آقا کے غلام بن جائیں اسی طرح ہمارے نزدیک مسلمانوں کا مقام یہ نہیں ہے کہ وہ دنیا کی اور قوموں کی طرح اپنے کو بھی ایک قوم فرض کر لیں اور پھر انہیں قوموں کی طرح قومی عزت و سربلندی کی فکر میں لگ جائیں اور اس طرح دنیا کے مفسد گروہوں میں ایک اور مفسد گروہ کا اضافہ کریں بلکہ ان کا اصلی مقام یہ ہے کہ وہ ایک اصولی جماعت اور پارٹی بن کر دنیا کے سامنے آئیں اور اپنے ان اصولوں کی عزت اور سربلندی کے لیے کوشاں ہوں، جن پر قوم اور ملک کی حقیقی سعادتوں کا دارومدار ہے۔ افسوس ہے اس حقیقت کو بھلا دیا جاتا ہے کہ اسلام کا مفاد اور مسلم قوم کا ہر طرح کا مفاد دونوں ہر حال میں ایک نہیں ہے۔ اور جب دونوں میں مطابقت ممکن نہ ہو ایک حقیقی مسلم کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ اسلام کے مفاد کو ترجیح دے اور مسلمانوں کے جھوٹے مفادِ قومی کو ترک اور نظر انداز کر دے ورنہ اس کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوگا کہ اس کی اسلامی حیثیت مجروح ہو جائے گی۔ بلکہ اس طرزِ عمل کی بنا پر خود اسلام بھی بدنام ہو جائے گا اور اس کی ترقی کی راہیں مسدود ہو جائیں گی جیسا کہ آج فی الواقع مسلمانوں کے اس قسم کے طرزِ عمل سے ہندوستان میں ہو رہا ہے کیونکہ قومی مفاد کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے کسی فرد یا جماعت کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ وہ عالمگیر اُصولوں کی علمبردار ہے اور اگر ایسا کرتے ہوئے کوئی یہ کہنے کی جرأت کرتا ہے تو ایسے شخص یا جماعت کی بات سُننے کے لیے کوئی شخص بھی آمادہ نہیں ہو سکتا ہے۔ تحریکِ

اقامتِ دین کی اسی خصوصیت کا نتیجہ ہے کہ ہم مسلمانوں کی طرح غیر مسلموں کے پاس بھی پہنچتے ہیں۔ ان کو اپنے اجتماعات میں شرکت کی دعوت دیتے ہیں چنانچہ اس اجتماع میں بھی ہمارے بہت سے مقامی غیر مسلم حضرات تشریف لے آئے ہیں۔ اور باہر سے بھی کچھ حضرات محض شرکت کی غرض سے آئے ہوئے ہیں۔ ان کے لیے ہم نے اپنے لٹریچر کو خاص اُن زبانوں میں منتقل کیا ہے اور کررہے ہیں، جس میں وہ عام بول چال کے عادی ہیں۔ اس وقت تک ملیالم، گجراتی، بنگالی، مراٹھی، ہندی اور انگریزی زبانوں میں ہمارے لٹریچر کا ایک معتدبہ حصہ منتقل کیا جاچکا ہے۔ اور خود قرآن شریف کے ہندی ترجمہ وتفسیر کا بھی ہماری طرف سے انتظام کیا جارہا ہے۔ اور اس کے پہلے[1] پارے کی طبع و اشاعت کے انتظامات عنقریب شروع ہونے والے ہیں۔ میں اس ضمن میں یہ بھی واضح کردینا چاہتا ہوں کہ ہماری یہ کوششیں ہمارے لیے کسی درجے میں بھی مایوس کن نہیں ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ایک طویل عرصے سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو قومی کشمکش جاری رہی ہے اور جس وجہ سے غیر مسلم حضرات کو خود اسلام سے بھی یک گونہ نفرت ہوگئی ہے وہ ہماری راہ میں ایک بڑی زبردست رکاوٹ ثابت ہورہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو ہماری حالت پر ہم سے قطع نظر کرتے ہوئے غور وفکر کرتے ہیں اور اُن میں سے بہتیرے ہماری باتوں کو سراہتے ہیں اور ہمیں توقع ہے کہ اگر ہم اپنے بارے میں اُن کو یہ اطمینان دلانے میں کامیاب ہوگئے کہ ہم نے یہ کام کسی قومی جذبے کے تحت یا قومی مفاد کے لیے شروع نہیں کیا ہے بلکہ اس سے ہمارا مقصد عمومی فائدہ ہے اور ساتھ ہی مسلمان بھی ہماری کچھ مدد کریں کہ وہ اپنے قوم پرستانہ طرزِ عمل سے اسلام کو اور خود اپنے کو نقصان پہنچانے سے باز رہیں تو ہم یقین رکھتے ہیں کہ غیر مسلم حضرات کا شک و شبہ اور اُن کی نفرت وبدگمانی بہت جلد رفع ہوسکتی ہے اور اس کے بعد اگر ضرورت رہتی ہے تو صرف اس بات کی کہ اسلام کو سمجھنے کے لیے ان کو پورے پورے مواقع خود ان کی زبانوں میں فراہم کیے جائیں۔ اور یہ ظاہر بات ہے کہ یہ کام بڑے اہتمام کا طالب

---

[1] پہلا پارہ ''پوتر قرآن'' کے نام سے شائع ہوچکا ہے۔ ناشر

ہے، جو سرِ دست ہمیں میسّر نہیں ہے۔ لیکن ہماری ذمے داری صرف اپنے وسائل و ذرائع کی حد تک ہے اور ان شاء اللہ ہم اس میں دریغ نہیں کریں گے۔ البتہ یہ منظر ہمارے لیے بڑا ہی اندوہناک ہے کہ ہندوستان میں مسلمان صدیوں سے رہ رہے ہیں لیکن اس کے باوجود ڈاکٹر پھٹا بھئی سیتا رمیّہ سابق صدر کانگریس کے بقول اسلام یہاں کے غیر مسلموں کے لیے ایک سربمہر کتاب ہے۔ یہ الفاظ انہوں نے ہمارے ایک رفیق کو اس وقت تحریر فرمائے تھے جب اُن کے پاس کچھ کتابیں برائے مطالعہ ارسال کی گئی تھیں اور انہوں نے یہ توقع ظاہر کی تھی کہ ان کا مطالعہ اس پہلو سے مفید ثابت ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے خود ہی اور کتابوں کی خواہش ظاہر کی تھی جو اُن کے پاس بھیج دی گئی ہیں۔ اور کچھ اسی طرح کے شوق کا اندازہ ہمیں جے پور کانگریس کے اجلاس کے موقعے پر بھی ہوا تھا جہاں جماعت کی طرف سے بک اسٹال لگایا گیا تھا۔ غیر مسلموں کی ایک بہت بڑی تعداد نے ہندی میں سیرتِ رسول اور ترجمۂ قرآن کا مطالبہ کیا تھا۔ لیکن کتنے افسوس کا مقام ہے کہ اُن کے حسب منشاء اور حسب ضرورت ان کی اس خواہش و مطالبہ کا امّت مسلمہ کی طرف سے اب تک کوئی انتظام نہیں ہوسکا ہے۔ بہر حال یہ ایک ضروری کام ہے جو ہونا چاہیے۔ لیکن میں یہاں دوبارہ یہ گزارش کرنی چاہتا ہوں کہ اصلی رکاوٹ یہ نہیں ہے کہ ہندی میں قرآن کا کوئی ترجمہ نہیں ہے بلکہ اصلی رکاوٹ یہ ہے کہ مسلمانوں کا صحیفہ زندگی غیر مسلموں کے لیے باعث نفرت ہے۔ مسلمان خواہ ان کو اس کا شعور ہو یا نہ ہو لیکن عام لوگوں کے نزدیک وہ اسلام کے نمائندے سمجھے جاتے ہیں۔ دنیا میں ایسے لوگ کم ہی ہوتے ہیں جو مجرد اصولوں کو دیکھ کر اُن پر ایمان لے آئیں وہ سب سے پہلے اُن کے ماننے والوں کو دیکھتے ہیں اور اُن کے عمل اور سیرت و کردار سے اُن کے بارے میں کوئی اچھی یا بُری رائے قائم کرتے ہیں اس لیے سب سے مقدم چیز یہ ہے کہ مسلمان اپنے عمل کو اسلام کے مطابق بنانے کی کوشش کریں تب ہی غیر مسلموں کا نقطۂ نظر اسلام کے بارے میں بدل سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سب سے پہلے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہیں اور اپنی توجہ اُن پر زیادہ صرف کرتے ہیں بلکہ اکثر اوقات ان کے سامنے کچھ تلخ نوائی بھی کرتے ہیں جو

ضرورت کا تقاضا ہے لیکن تلخ نوائی قدرتی طور پر بہت سے لوگوں کو ناگوار گزرتی ہے اور اس کی بنا پر ہمیں خارجیت وغیرہ کے طعنے دے کر بدنام کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ہم اس طرح کے طعنوں سے گھبراتے نہیں، کیونکہ خارجیت سے ہم بھی واقف ہیں اور اُن کے مقابلے میں ان سے کم نفرت نہیں رکھتے ہیں اور یہ چیز ہمارے نزدیک خارجیت نہیں ہے کہ مسلمانوں کو مسلمان سمجھتے ہوئے یٰٓاَیُّھَاالَّذِینَ آمَنُوا اٰمِنُوا، کے اصول پر عمل کی دعوت دی جائے۔ یہ اگر خارجیت ہے تو مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ یہ لوگ اس طرح کی باتوں پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور اپنا فریضہ بس اتنا ہی سمجھتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو اپنی طرف سے بشارتیں سُناتے اور طفل تسلیاں دیتے رہیں۔ مثلاً یہ کہ محض کسی مسلمان کے گھر پیدا ہو جانا، ختم و فاتحہ دلا دینا، شادی وغم کے مواقع پر کچھ الٹی سیدھی رسمیں ادا کر دینا محض یہی باتیں مسلمان ہونے کے لیے کافی ہیں تو خارجیت ہی کی طرح کی ایک دوسری گمراہی بلکہ اس سے بھی زیادہ بدترین گمراہی کے جسے ارجاء کہا جاتا ہے یہ لوگ شکار ہیں اور یہ لوگ اپنے اس طرزِ عمل کی وجہ سے یہی نہیں کہ عام مسلمانوں پر اسلام کی راہیں بند کر رہے ہیں بلکہ وہ خود اسلام کی راہ میں بھی روڑے اٹکا رہے ہیں کیوں کہ اسلام کی ترقی میں آج سب سے بڑی رکاوٹ خود مسلمانوں کی بے عملی ہے، جس کی وجہ سے اسلام آج دنیا کی نگاہوں میں ذلیل وخوار ہو کر رہ گیا ہے۔

جماعت اسلامی کا طریق کار

مقصد اور اس کے بنیادی اصولوں کی اس توضیح کے بعد اب میں آپ کے سامنے اپنے طریق کار کے بارے میں بھی کچھ باتیں عرض کرنی چاہتا ہوں۔ ہم نے جس طرح اپنے مقصد اور اس کے بنیادی اصول کو کتاب وسنت اور اسوۂ انبیاء سے حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اسی طرح ہم اپنے طریق کار کے بارے میں بھی وہیں سے ہدایت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اخلاق کی اہمیت

ہم نے اُن سرچشموں سے چند باتیں پائی ہیں۔ اُن میں سے پہلی بات یہ ہے کہ جو دینی انقلاب ہمارے پیش نظر ہے اس کے لیے وہ طریقے کسی طرح مناسب نہیں ہو سکتے جو غیر دینی تحریکات میں اختیار کیے جاتے ہیں۔ ہمارے دین میں جس کو ہم برپا کرنا چاہتے ہیں، جھوٹ، مکروفریب اور ظلم وزیادتی وغیرہ کی مطلق گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے ہم جو کچھ کہتے یا کرتے ہیں علانیہ کہتے اور کرتے ہیں۔ ہماری کوئی چیز راز نہیں ہے اور جو ہمارے دل میں ہے وہی ہماری زبانوں پر ہے۔ اگر ہم اس کے سوا کوئی طریق اختیار کریں تو اس کے معنی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتے کہ ہم جس چیز کو قائم کرنے کے لیے کھڑے ہوئے ہیں اس کی خود سب سے پہلے اپنے ہی ہاتھوں جڑیں کاٹ دیں۔

توڑ پھوڑ ہمارا طریقہ نہیں

دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے سامنے توڑ پھوڑ اور تخریب وغیرہ کی قسم کا بھی کوئی کام نہیں ہے کیوں کہ ہم جو کچھ چاہتے ہیں اس کے لیے صحیح طریقۂ کار یہی ہو سکتا ہے کہ سب سے پہلے انسان کے فکر و

ذہن کی اصلاح کی جائے۔ انبیاء کرام نے یہی طریقہ اختیار کیا ہے اور خود رسول اللہ ﷺ کا بھی اسوۂ حسنہ یہی ہے جیسا کہ حضرت عائشہؓ کے اس قول سے واضح ہے، جس میں آپؓ نے فرمایا ہے کہ شراب کی حرمت کا اعلان اس وقت ہوا جب لوگوں کے ذہن میں اللہ کا خوف اور جزا وسزا کا عقیدہ بٹھا دیا گیا ورنہ ایک شخص بھی ترکِ شراب پر آمادہ نہ ہوتا۔ خود آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

اَلَااَنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَۃً اِذَااَصْلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ وَ اِذَا فَسَدَ فَسَدَ الجَسَدُ کُلُّہٗ اَلاوَھِیَ الْقَلْبُ.

"سُن رکھو! جسمِ انسانی میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب تک وہ صحیح حالت میں رہتا ہے پورا جسم ٹھیک رہتا ہے اور جب وہ خراب ہو جاتا ہے تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے۔ سُن لو یہ ٹکڑا انسان کا دل ہے۔"

پس ہمارے نزدیک حکومت کی تبدیلی کا سوال ہو یا اقتصادی وسماجی نظام میں تبدیلی کا، اس میں اس وقت تک کامیابی نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے لیے ذہن ودماغ کی اصلاح نہ ہو جائے اور اگر ہو گی تو اس کی حیثیت ایک عارضی شئے کی ہو گی۔ وہ زیادہ عرصے تک برقرار نہیں رہ سکتی۔

اصلاحِ قلب کی عملی شکلیں

قلب وذہن کی تبدیلی کے سلسلے میں جو باتیں ہمارے پیشِ نظر ہیں ان کی تفصیل یہ ہے کہ ہم سب سے پہلے لوگوں کے ذہن کو غلط افکار ونظریات سے پاک کرنا چاہتے ہیں جو مغربی تہذیب وتمدّن کے غلبہ واستیلاء کی بدولت عام لوگوں کے ساتھ خود مسلمان تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہن ودماغ میں گھس پڑے ہیں۔ مسلمان نام کی قوم میں بے شمار ایسے افراد پائے جاتے ہیں جو اپنے کو مسلمان بھی کہتے ہیں اور ساتھ ہی وہ اپنا رشتہ کمیونزم اور سوشلزم وغیرہ سے جوڑتے ہیں۔ بہتوں نے تو یہ جانتے ہوئے یہ رشتہ جوڑا ہے کہ اس کے بعد اسلام سے ان کا رشتہ باقی نہیں رہ سکے گا۔ البتہ مصلحتاً وہ اپنے کو مسلمان کہتے رہتے ہیں۔ اور بہتوں نے یہ رشتہ جوڑتے وقت یہ سمجھا ہی نہیں ہے کہ ان رشتوں کا اُن کے اسلام کے ساتھ رشتے پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔

دوسرا طبقہ عوام کا ہے جو جدید افکار ونظریات سے براہ راست متأثر نہیں ہے اور نہ وہ

دین کے چھوڑنے پر آمادہ ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ دین کے بارے میں اُن کی معلومات بہت تھوڑی ہیں۔ اور عملی طور سے بھی اُن کے پاس دین کا جو سرمایہ ہے وہ دین کی چند چھوٹی چھوٹی باتوں اور رسم ورواج کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس لیے ان کی خواہش کے خلاف دین کا رشتہ ان کے ہاتھوں سے چھوٹتا جارہا ہے۔ ان حالات میں ہمارے نزدیک سب سے مقدم کام یہ ہے کہ عہد حاضر کے افکار ونظریات پر خاص عملی اور عقلی بنیادوں پر گہری تنقید کر کے ان کا کھوکھلا پن نمایاں کیا جائے اور پھر اس کے ساتھ اس کے مقابلے میں اسلام کو اس حیثیت سے پیش کیا جائے کہ جن مسائل کے حل کے لیے ان نظریات کا سہارا ڈھونڈا جاتا ہے اُن کا سب سے بہتر حل خود اسلام پر قائم و برقرار رکھنے کے لیے اگر کوئی چیز مفید ہوسکتی ہے تو وہ جماعت اسلامی کا لٹریچر ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر بعض مشہور علماء کا جو جماعت سے تعلق تو نہیں رکھتے لیکن اس سے پوری واقفیت رکھتے ہیں یہ اعتراف ہے کہ جماعت اسلامی کا ایک معمولی رکن اسلام کے خلاف نظریات سے اس سے زیادہ واقفیت رکھتا ہے جتنی کہ عام دارالعلوموں کے بہت سے بیضاوی و بخاری پڑھنے والے رکھتے ہیں۔ اس لٹریچر کا غیر مسلم حضرات نے بھی مطالعہ کیا ہے اور وہ بھی اس کی حیثیت کے معترف اور قائل ہیں۔ یہ کام تو تعلیم یافتہ طبقے کی ضرورت کے پیش نظر ہے اور جہاں تک عام مسلمانوں کا تعلق ہے ہماری کوشش ہے کہ ہم اسلام کے بنیادی عقائد اور اعمال کی اس طرح توضیح و تفصیل کریں کہ وہ اُن کے ذہنوں میں پورے رسوخ اور استحکام کے ساتھ جاگزیں ہوجائیں، جس کے بعد ہمیں توقع ہے کہ دین کے ساتھ علمی اور عملی دونوں طرح کا لگاؤ بہت مضبوط اور مستحکم ہوجائے گا۔ اور جس کے بعد افکار باطلہ سے ان کے متاثر ہونے کا کوئی امکان باقی نہیں رہے گا۔ اس کے بعد جو لوگ ہماری ان کوششوں سے متاثر ہوتے ہیں ہم اُن کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اس کے مطابق سب سے پہلے اپنی زندگیوں میں تبدیلی پیدا کریں۔ اور پھر مجتمع ہوکر اس قسم کی تبدیلی کے لیے جدوجہد عمل میں لے آئیں۔ ہماری دعوت یہ نہیں ہوتی کہ وہ اس غرض کے لیے لامحالہ ہماری جماعت ہی میں شامل ہوں لیکن اگر وہ اس پر ازخود آمادہ ہوتے ہیں تو ہم اُن کو جماعتی نظم کے ساتھ وابستہ کرلیتے ہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ آٹھ دس سال کے عرصے میں ایک چھوٹی سی جماعت، جس کے ارکان کی تعداد پورے ہند میں ۳۸۹ سے زیادہ نہیں ہے وجود میں آگئی ہے اور اسی جماعت کا نام جماعتِ اسلامی ہے، جس کے اجتماع میں آپ اس وقت تشریف فرما ہیں۔

بعض غلط فہمیوں کا ازالہ

یہ ہے جماعتِ اسلامی کا مقصد، اصول اور طریق کار، جس کی توضیح کے ضمن میں غالباً بہت سی غلط فہمیاں خود بخود درفع ہوگئی ہوں گی۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ آگے بڑھنے سے پہلے بعض خاص طرح کی غلط فہمیاں جو بالعموم ناواقفیت کی بنا پر پیش آتی ہیں یا جن کو ہمارے بہت سے مہربان ایک کارثواب سمجھ کر عوام میں پھیلاتے رہتے ہیں، مختصراً اُن کا بھی ازالہ کردوں۔

فرقہ بندی کا الزام

اوپر مختصراً اس کا ذکر آچکا ہے کہ جماعتِ اسلامی کس طرح وجود میں آئی ہے اور اس میں جو لوگ شریک ہوتے ہیں وہ کس طرح شریک ہوتے ہیں۔ ہمارے نزدیک بظاہر اس پر کوئی اعتراض کا موقع نہیں ہوسکتا تھا۔ لیکن جو لوگ منتشر طرز زندگی کے عادی ہیں یا جن کو اس کے لیے کسی اجتماعی جدوجہد سے کسی وجہ سے اختلاف ہے، انہوں نے اس چیز کو بھی ہماری مخالفت یا ہم پر اعتراض کا بہانہ بنالیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جماعت بنا کر ہم نے امت میں ایک نئے فرقے کی بنیاد ڈالی ہے اور ہم امت میں انتشار کا موجب بن رہے۔ ہیں حالانکہ یہ غور کرنے کی بات ہے کہ ہماری دعوت انتشار کی موجب ہے یا اتحاد کی۔ اور ہماری حیثیت کسی فرقے کی ہے یا یہ کہ ہماری تحریک فرقہ بندیوں کے خاتمے کی موجب ہے۔

اصولوں کی توضیح کے ضمن میں یہ آپ کو پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ ہم دین میں کسی نئی بات کا اضافہ نہیں کررہے ہیں اور نہ اس کے کسی خاص جز کو لے کر اس کو اس سے زیادہ اہمیت دینا چاہتے ہیں، جتنی اہمیت فی الواقع اس کے لیے ہے اور یہی دو باتیں ایسی ہیں، جن کی وجہ سے دین

میں فرقے پیدا ہوتے رہے ہیں۔ ہم تو دین کے بنیادی اصولوں کو جو دین سے قطعیت کے ساتھ ثابت ہوں لے کر چلنا چاہتے ہیں اور یہ اُصول ایسے ہیں کہ اُن میں نہ صرف مسلمانوں کے تمام فرقے ضم ہو سکتے ہیں بلکہ اگر وہ اصول اپنا لیے جائیں تو مسلمانوں سے باہر جو تفریقیں قائم ہیں وہ بھی مٹ سکتی ہیں۔ ایسی حالت میں یہ فرقہ بندی کا الزام بہت ہی عجیب الزام ہے۔ پھر یہ بات بھی نہیں ہے کہ ہم کسی شخصیت کے بارے میں جس کا جماعت سے تعلق ہو، یا خود جماعت کے بارے میں کسی طرح کے غلو سے کام لے رہے ہیں جیسا کہ فی الواقع وہ لوگ کر رہے ہیں جو اپنی آنکھ کے شہتیر کو نظر انداز کر کے ہماری آنکھوں کے تنکے تلاش کرنے میں مصرف ہیں۔ ہمارا ہرگز یہ خیال نہیں ہے کہ صرف ہماری جماعت حق ہے۔ اور جو اس میں داخل نہیں ہے وہ لازماً اسلام کے دائرے سے خارج ہے اور اس کی بارہا ہماری طرف سے تشریح کی جا چکی ہے اور خود جماعت کے دستور میں اس کی صراحت موجود ہے۔ اسی طرح مولانا مودودی صاحبؒ کے بارے میں بارہا وضاحت کی جا چکی ہے کہ ہمیں ان کی ذات یا فقہ و کلام کے بارے میں اُن کے شخصی افکار و خیالات سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے اور خود انہوں نے اس کی وضاحت کر دی ہے کہ ہمارا اصلی تعلق صرف اس بنیادی دعوت سے ہے، جس کو جماعت اسلامی نے بہ طور مقصد کے اختیار کیا ہے اور یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو مولانا مودودی کی ایجاد کردہ ہو۔ بلکہ وہ قرآن و سنت کی دعوت ہے اور ہم نے اس کو اسی حیثیت سے قبول کیا ہے کہ خود ہمارے علم نے بھی اس کی تصدیق کی ہے کہ یہ قرآن و سنت کی دعوت ہے نہ اس بنا پر کہ مولانا مودودی نے اس کو پیش فرمایا ہے۔ اور آج تک مجھے ایک شخص بھی ایسا نہیں ملا، جس کو اس کے حق ہونے سے انکار ہو، البتہ جو لوگ اس فرق کو نظر انداز کر کے غور کرتے ہیں کہ جماعت اسلامی کی اصل دعوت اور مولانا مودودی کی شخصیت یا اُن کے شخصی افکار و نظریات دو الگ چیزیں ہیں وہ ضرور اس معاملے میں گڑبڑا جاتے ہیں اور اُن میں ہمیں کچھ ایسے لوگ بھی ملتے ہیں، جن پر مولانا مودودی سے اختلاف کا اتنا گہرا اثر پڑ جاتا ہے کہ وہ نفس دعوت کی مخالفت پر بھی کمر بستہ ہو جاتے ہیں۔ میرے نزدیک اگر یہ حضرات سنجیدگی اور سکون کے ساتھ غور فرمائیں گے تو اُن کو اپنی اس حرکت پر خود پشیمان ہونا پڑے گا۔ بہرحال میں اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پھر اعلان کرتا ہوں کہ ہمیں اور جماعت اسلامی کی دعوت کو مولانا مودودی صاحب کو سامنے رکھ کر نہ جانچیے بلکہ ان کو الگ الگ کر کے غور کیجیے اور پھر کوئی

فیصلہ صادر کیجیے۔ آپ کو مولانا مودودی صاحب کی کسی رائے سے اختلاف ہے تو آپ شوق سے اختلاف کیجیے۔ ممکن ہے تحقیق کے بعد ہم بھی آپ کی تحقیق سے اتفاق کرسکیں۔ لیکن اس کی وجہ سے جماعت کی اصولی اور بنیادی دعوت سے اختلاف کرنا تو کسی طرح جائز نہیں ہوسکتا اور اب تو جماعت اسلامی ہند کے ضمن میں مولانا مودودی صاحب کا نام لینا بھی ایک زیادتی کی ہی بات ہے۔ کیونکہ تقسیم ہند کے بعد مولانا کا یہاں کی جماعت سے کوئی تعلق باقی نہیں رہ گیا ہے۔ حتیٰ کہ خیر و عافیت کے سلسلے میں بھی ہماری مولانا سے خط و کتابت بند ہے۔ رہی یہ بات کہ مولانا مودودی صاحب کے شخصی خیالات و افکار ضروری طور پر جماعت کے لوگوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ تو میرا خیال ہے کہ جو لوگ اس بارے میں اس طرح کے اندیشوں میں مبتلا ہیں اُن کے سامنے غالباً خاص خاص طرح کے حلقہ ہائے ارادت ہیں جہاں کسی نہ کسی حضرت فلاں کو یہ مقام حاصل ہوتا ہے کہ اُن کی ہر بات محض اس سند پر حق مان لی جائے کہ حضرت نے فرمایا ہے۔ حالانکہ جماعت اسلامی میں اس طرح کی کسی بات کی گنجائش نہیں ہے۔ یہاں:

بہ مے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید

کے بجائے یہ سبق پڑھایا جاتا ہے کہ مطلقاً واجب الاطاعت ہستی صرف خدا کی ہے اور اُس کے بعد اس کے رسولؐ کی اور اس کے بعد ہر ایک کی اطاعت اُن دونوں کی اطاعت کے تحت اور اُن کی عطا کردہ اجازت کے اندر ہوسکتی ہے اور بس۔ بلکہ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ مولانا مودودی صاحب نے اپنی تصانیف میں تنقید کی جو روش اختیار کی ہے اور جس کے یہ معترضین بہت زیادہ شاکی ہیں بلکہ اس کی بنیاد پر ان میں سے بعضوں نے ان کے اور اُن کے ساتھ پوری جماعت کے گمراہ ہونے کا فتویٰ صادر فرمایا ہے۔ اگر اُن کے معتقدین واقعی اُن کے قول و عمل کو حجّت بنا سکتے ہیں۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے تو اس کا خود یہ نتیجہ ہونا چاہیے کہ وہ خود اُن کو بھی تنقید سے بالاتر نہ رکھیں۔ آخر کوئی وجہ تو ہونی چاہیے کہ ان کے متاثرین ہر بات میں تو اُن کی تقلید کریں اور وہ صرف اسی ایک بات میں پیچھے رہ جائیں۔ درآں حالیکہ اُن کی یہی ایک بات ان کی تحریروں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔

بہرحال فرقہ بندی کے الزام کے سلسلے میں یہ تو عقلی طور سے غور کرنے کی باتیں ہیں لیکن میں اس

کے علاوہ یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جماعت اسلامی کو وجود میں آئے اب دس سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔ اس دوران میں ہم برابر لوگوں کے ساتھ رہتے سہتے چلے آ رہے ہیں ہمیں بتایا جائے کہ ہمارا طرز عمل کس بات کا گواہ ہے۔ آیا اس بات کا کہ ہم مسلمانوں سے الگ کوئی فرقہ ہیں یا یہ کہ ہم اُنہیں میں شامل ہیں؟ کیا ہم نے اپنی نمازیں اُن سے الگ قائم کیں؟ کیا ہم نے اُن سے اپنے شادی بیاہ کا رشتہ منقطع کر لیا ہے؟ کیا ہم نے اپنا الگ قبرستان بنایا ہے؟ پھر آخر ہم کو ایک الگ فرقہ کس بنیاد پر کہا جا سکتا ہے؟ اور اس ضمن میں یہ بات نہ بھولیے کہ جو لوگ ہم پر فرقہ بندی کا الزام لگا رہے ہیں انہوں نے اپنے طور پر ہمیں فرقہ بنانے کی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔ خارجیت کا الزام انہوں نے لگایا ہے ہمارے پیچھے نمازیں نہ پڑھنے کا فتویٰ انہوں نے صادر فرمایا ہے۔ اور مسلمانوں کو ہم سے علیحدہ کرنے کی رات و دن کوششیں وہ کر رہے ہیں۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہمارا جو طرز عمل شروع سے رہا ہے وہی اب بھی قائم ہے۔ ہمارا خدا سے یہ عہد ہے کہ اگر یہ لوگ ہمیں کاٹ کر الگ بھی کرنا چاہیں گے تا کہ اُن کی یہ خواہش یا الزام پورا ہو سکے کہ ہم اُن سے علیحدہ ہیں تو بھی ہم "وَصِلُ مَنۡ قَطَعَكَ" پر عمل کرتے ہوئے اُن سے علیحدہ نہیں ہوں گے الّا یہ کہ خدانخواستہ خدانخواستہ دعوتِ حق کی یہ مخالفتیں اپنی انتہا کو پہنچ جائیں۔ اور اس وقت خود اسلام ہی ہمیں علیحدگی کا حکم دے۔ البتہ میں یہ صاف صاف کہنا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے ساتھ ہماری یہ پیوستگی اس معنیٰ میں نہیں ہو سکتی کہ ہم ان کی خاطر ان باتوں کو جو حق ہیں حق کہنا چھوڑ دیں۔ یا اُن کو خوش کرنے کے لیے ہم بھی اپنے آپ کو انہیں اعمال میں ملوث کرنے پر آمادہ کر لیں، جن کو ہم پوری دیانتداری کے ساتھ اپنے لیے غلط سمجھتے ہیں۔ اگر فرقہ بننے کے معنی یہی ہیں کہ ہم ان چیزوں میں اُن سے الگ رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے فرقہ ہونے کا اعتراف ہے اور ایسی صورت میں اگر یہ الزام لگانے والے اَخۡرِجُوۡهُمۡ مِّنۡ قَرۡيَتِكُمۡ ۚ اِنَّهُمۡ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوۡنَ ۝ (الاعراف: ۷۲) "ان کو اپنی بستی سے نکال دو، یہ پاک باز لوگ ہیں۔" کا رجز پڑھتے ہوئے ہمیں اپنی بستیوں سے نکال دینے پر بھی آمادہ ہو جائیں تو بھی ہم اُن کو راضی کرنے کی خواہش نہیں کریں گے۔ ہم پہاڑوں اور بیابانوں میں رہنے کے لیے آمادہ ہیں لیکن اُن کی خاطر ہم اس پر راضی نہیں ہیں کہ ہم جن چیزوں کو غلط سمجھتے ہیں اُن کو اختیار کر کے خدا کی ناراضگی مول لیں اور مزید گنہگار بنیں۔

حضرات! جماعت اسلامی جو کچھ چاہتی ہے اور جس طرح چاہتی ہے اس کی بہ قدر ضرورت تفصیل سامنے آ چکی ہے۔ اب میں مسلمانوں اور غیر مسلم حضرات سے کچھ باتیں الگ الگ خطاب کر کے کہنی چاہتا ہوں۔

مسلمانوں سے خطاب

مسلمانوں سے جو بات مجھے کہنی ہے، وہ یہ ہے کہ اقامتِ دین کا جو کام جماعت لے کر کھڑی ہوئی ہے اُسے وہ بھی انجام دینے کے لیے کھڑے ہو جائیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ کام آپ ہمارے ساتھ مل کر ہی انجام دیں۔ اگر آپ کو ہم پر اعتماد نہیں ہے تو آپ شوق سے ہم سے علیحدہ رہیں اور کسی ایسی جماعت میں شریک ہو جائیں جو اس کام کو انجام دے رہی ہو اور اس پر آپ کو اعتماد ہو۔ اور اگر آپ کی نگاہ میں سرے سے کوئی ایسی جماعت موجود ہی نہ ہو جو اس کام کو کر رہی ہو اور جس کے ساتھ مل کر آپ یہ کام کر سکیں تو اس کے لیے آپ اپنی کوئی علیحدہ جماعت قائم کریں، ہمیں اس سے مطلق اختلاف نہیں ہوگا بلکہ جہاں تک ہو سکے گا ہم اس بارے میں آپ کی مدد کریں گے بلکہ صحیح سمت سفر کرتے ہوئے اگر آپ کو پائیں گے تو ہمیں خود آپ کے پیچھے چلنے میں مطلق عار نہ ہوگا۔ ان باتوں میں سے جو بھی آپ کو پسند ہو آپ اُسے اختیار کر سکتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک یہ بات کسی طرح آپ کے لیے جائز نہیں ہو سکتی کہ آپ ان صورتوں میں سے کوئی ایک صورت بھی اختیار نہ کریں۔ اور اپنی زندگی یوں ہی گزارتے رہیں۔ اقامتِ دین کا کام انفرادی طور سے بھی ہر مسلمان کا فریضہ ہے اور اجتماعی طور پر بھی اس فریضے کو انجام دینے کی ذمے داری پوری امت پر عائد ہوتی ہے اور اسی کام کے ہونے پر درحقیقت ان کی دنیاوی کامیابی کا بھی دارومدار ہے۔ آج مسلمانوں کو دینی یا دنیاوی حیثیت سے جو بدبختیاں بھی پیش آ رہی ہیں وہ درحقیقت اسی فرض سے غفلت اختیار کرنے کا نتیجہ ہیں۔

اقامتِ دین سے غفلت کے نتائج

اقامت دین کی کسی زندہ اور متحرک جدوجہد کے سامنے نہ ہونے کے نتیجے میں گوناگوں خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ پہلی خرابی یہ ہے کہ اس کی وجہ سے خود مسلمانوں کا دینی نقطۂ نظر محدود اور بے جان

ہوتا جارہا ہے اور اُن کا ایک بہت بڑا طبقہ دین سے غافل اور بے پروا ہو گیا ہے۔ دین زیادہ تر چند جزئی احکام دین تک میں محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اور زندگی کے دوسرے اہم گوشے، جن کو بہر حال احکام دین کے تحت ہی ہونا چاہیے۔ دین کے حدود سے خارج قرار دے دیے گئے ہیں پھر چونکہ دین کے تمام اجزا باہم مربوط ہیں اور وہ تمام جسمِ انسانی کی طرح ایک دوسرے سے الگ ہونے کے بعد باقی اور زندہ نہیں رہ سکتے۔ اس لیے جن گوشوں میں انہوں نے دین کو باقی اور زندہ رکھا تھا وہ گوشے بھی رفتہ رفتہ دین کے اثرات سے خالی ہوتے جارہے ہیں۔ اور اس کا سلسلہ ایک عرصے سے قائم ہے اور اب اس کے اثرات زیادہ بین طور سے محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ دوسری خرابی یہ نمودار ہوئی ہے کہ ہندوستان میں اسلام کی نمائندگی جس طرح ہونی چاہیے تھی نہیں ہوسکی ہے۔ کتابوں میں تو سب کچھ موجود ہے لیکن مسلمانوں کا صحیفۂ زندگی اس سے یکسر خالی ہے۔ ان کے اوراق زندگی کو دیکھ کر کوئی غیر مسلم اسلام کے بارے میں کوئی اچھا تصور قائم نہیں کرسکتا۔ ان میں بلا شبہ ایسے افراد بھی بہ کثرت موجود ہیں جو اپنی شخصی سیرت و کردار اور اصلاح و تقویٰ کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہیں اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ ان بزرگ ہستیوں کا مسلم اور غیر مسلم بے شمار افراد پر اچھا خاصا اثر بھی پڑا ہے لیکن یہ واقعہ ہے جس سے انکار کرنا محض ہٹ دھرمی ہے کہ بحیثیت مجموعی امتِ مسلمہ کا عام معیار زندگی غیر مسلموں کے لیے کسی طرح بھی باعثِ کشش ثابت نہیں ہوا ہے اور اگر مسلمانوں کا کوئی خصوصی امتیاز کسی درجے میں نمایاں بھی ہوسکا ہے تو یہ امتیاز زیادہ تر اُن کی انفرادی زندگی کی حد تک محدود رہا۔ لیکن جہاں تک اجتماعی مسائل و معاملات کا تعلق ہے اس کے سلسلے میں مسلمانوں کا طرز زندگی کوئی امتیازی چیز نہیں پیش کرسکا اس لیے ان امور کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر غیر مسلموں کی نگاہوں سے زیادہ تر او جھل رہا اور اگر کچھ نمایاں بھی ہوا تو صرف اس حد تک کہ اُن کے حل کے لیے اسلام کے پاس بھی سوائے قومی فکر و نظر کے اور کوئی الگ یا ممتاز چیز نہیں ہے۔

تیسرا نقصان اقامت دین کی جدوجہد سے غفلت اختیار کرنے کا یہ ہوا کہ ان کی دنیا بھی سدھرنے کے بجائے اور زیادہ برباد ہوتی جارہی ہے۔ اسلام صرف اُخروی زندگی کی کامیابی کا ضامن نہیں ہے بلکہ دنیاوی فوز و فلاح بھی اس کے دامن سے وابستہ ہے۔

مسلمانوں کا دنیوی حیثیت سے بھی سب سے زیادہ روشن زمانہ وہ ہے جب وہ اپنے

دینی احکام کے صحیح معنی میں متبع تھے اور جوں ہی ان کا رشتہ اس سے کمزور ہونا شروع ہوا اسی وقت سے ان پر ادبار اور انحطاط بھی طاری ہونے لگا۔ یہی صورت حال ہندوستان میں بھی پیش آئی۔ یہ غلط ہے کہ ہندوستان میں اُن کی محکومی انگریزوں کی کیّا دیوں یا اُن کی چیرہ دستیوں کا ہی نتیجہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انگریزوں کی آمد سے پہلے مسلمان اخلاقی حیثیت سے بہت کھوکھلے ہو چکے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ کے قانون:

اِنَّ اللّٰهَ لَایُغَیِّرُ مَابِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَابِاَنْفُسِهِمْ ط (الرعد:۱۱)

''یقیناً اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت کو نہ بدل دے۔''

کے بموجب اقتدار اُن کے ہاتھوں سے چھین کر انگریزوں کے سپرد کر دیا گیا لیکن اس کے بعد بھی اُن کی آنکھیں نہ کھُلیں اور اصل مرض کا ازالہ کرنے کے بجائے انہوں نے اپنی اصل بیماری یہ سمجھی کہ وہ مغربی تہذیب میں انگریزوں سے پیچھے ہیں۔ اس لیے وہ ہر معاملے میں اُن کی تقلید کرنے پر آمادہ ہوگئے۔ یہاں تک کہ اپنے دنیاوی مسائل کو انہوں نے کلیتہً انہیں کے سکھائے ہوئے طریقوں سے حل کرنا چاہا۔ انہوں نے دین کے دامن میں پناہ لینے کے بجائے اپنا دامن قومیت سے وابستہ کر دیا یا وطنیت سے اور دونوں قسموں کی تحریکیں اُن میں چلتی رہیں تا آنکہ ان دونوں کو کامیابی حاصل ہوگئی۔ لیکن مسلمانوں کی قسمت میں سوائے ناکامی کے اور کچھ نہیں آیا، جیسا کہ حالات سے واضح ہے۔ اگر کچھ آیا تو صرف یہ کہ مسلمان اپنے اصلی کام اور غرض سے دور جا پڑے۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں میں نفرت اور عداوت کی ایک نا قابل عبور خلیج حائل ہوگئی۔ جس کا نقصان مسلمانوں ہی تک محدود نہیں رہا، بلکہ اس کا بہت کچھ حصّہ اسلام کو بھی ملا۔ کیونکہ بد قسمتی سے مسلمانوں نے جو کام بھی کیا اسلام کے نام پر اور اسلام کے نعروں کے ساتھ کیا خواہ اس کا اسلام سے تعلق رہا ہو یا نہ رہا ہو۔ اس لیے اسلام بھی اس وقت ان کی نگاہوں میں مطعون اور قابلِ نفرت ہے۔ بہر حال یہ پرانی داستان ہے، جس کو دہرانے کا کوئی خاص نتیجہ نہیں ہے۔ البتہ اب مسلمانوں کو آئندہ کی فکر کرنی چاہیے۔ اس کے لیے ہمارے نزدیک صحیح طریقۂ کار یہی ہوسکتا ہے کہ وہ اللہ سے اپنے عہد کو استوار کریں اور اسلام جو کچھ چاہتا ہے اس کے مطابق اپنے عمل میں تبدیلی پیدا کریں، جس میں سب سے مقدم چیز یہ ہے کہ وہ قوم ہونے کا تصور ترک کر کے ایک

داعی الی الخیر اور شہداء اللہ فی الارض کی حیثیت میں اپنے کو منتقل کرلیں اس طرح ایک طرف ان کی دنیا درست ہوسکتی ہے کیونکہ غیر مسلموں کو ایک قوم سے جو اُن کی حریف بن کر سامنے آئے تو ضرور نفرت ہوسکتی ہے لیکن نیکیوں سے اور نیکیاں پھیلانے والوں سے ان کی نفرت کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی اور یقین کیجیے آج دنیا کی سب سے زیادہ کمیاب چیز یہی ہے اس لیے دنیا کو سب سے زیادہ تلاش اسی چیز کی ہے اور اگر یہ فائدہ حاصل ہونے میں کچھ دیر بھی ہو تو اللہ سے اور اس کے دین سے تعلق استوار کرنے کا یہ ایک فوری فائدہ تو ضرور حاصل ہوسکتا ہے کہ آج مسلمان جس خوف و ہراس میں مبتلا ہیں اور جس نے ان کی زندگیوں کو جہنم کا نمونہ بنا رکھا ہے اس کا چشم زدن میں خاتمہ ہوجائے کیونکہ خدا سے تعلق جوڑ لینے کے بعد آدمی کو پھر کوئی خوف دامن گیر ہی نہیں ہوسکتا۔ اور یقیناً یہ بہت بڑا فائدہ ہے۔ دوسری طرف آخرت کی ابدی زندگی بھی اسی طریقہ کے اختیار کرنے سے کامیاب و بامراد ہوسکتی ہے اور یقیناً یہ بہت بڑی کامیابی ہے، جس کے حصول کا اس کے سوا اور کوئی طریقہ بھی نہیں ہے۔

یہ ہے ہمارا مختصر پیام جو ہم مسلمانوں کو سنانا چاہتے ہیں۔

غیر مسلموں سے خطاب

اب میں کچھ باتیں اپنے غیر مسلم بھائیوں سے بھی کہنی چاہتا ہوں۔ جماعتِ اسلامی کی دعوت کا خلاصہ آپ نے سُن لیا ہے۔ ظاہر ہے، ہم جو کچھ چاہتے ہیں وہ کسی ایک صحبت میں مفصل طور سے بیان نہیں کیا جاسکتا لیکن جتنا کچھ بھی آپ نے سُنا ہے اگر اس کے سُننے کے بعد آپ ضرورت محسوس کرتے ہیں تو ہماری پوری دعوت پوری فراخدلی کے ساتھ مطالعہ فرمائیں اور اس کے بعد آپ فیصلہ کریں کہ ہماری دعوت آپ کے لیے اور پورے ملک کے لیے کس درجے مفید یا مضر ہوسکتی ہے۔ مسلمانوں کے ضمن کے مسائل کی تشریح میں وقت زیادہ صرف ہوگیا ہے اس لیے اس وقت میں اس پہلو پر کوئی تفصیلی گفتگو نہیں کرسکتا کہ آج ملک میں جو پیچیدہ مسائل پیدا ہوگئے ہیں وہ ہمارے اصولوں کے تحت کس طرح حل کیے جاسکتے ہیں لیکن اس پہلو کی وضاحت میرے ایک رفیق نے اس سے پہلے کسی حد تک کردی ہے۔ آپ اس پر غور فرمائیں اور ضرورت سمجھیں تو ہم اُن پر آپ سے تبادلہ خیالات کرنے کے لیے پوری طرح آمادہ ہیں۔ بہر حال ہماری باتوں کو

آپ اس لیے نظر انداز نہ کردیں کہ ہم مسلمان ہیں یا ہم نے اپنی بات چیت میں ہر موقعے پر اسلام کا نام لیا ہے۔ اسلام جیسا کہ میں پہلے تشریح کر چکا ہوں مسلمانوں کا کوئی مخصوص مذہب نہیں ہے بلکہ وہ آپ کا بھی ویسا ہی ہے جیسا مسلمانوں کا ہے اگر مسلمان اس کو اپنا مخصوص مذہب سمجھتے ہیں تو یہ ان کی غلطی ہے اور اس غلطی کی وجہ سے اس پر سے آپ کا حق ساقط نہیں ہوسکتا ہے اگر دنیا میں کسی مشترک چیز پر کسی ایک فریق کے قبضے کو آپ برداشت نہیں کر سکتے ہیں تو دین تو دنیا کی ہر چیز سے زیادہ قیمتی اور گراں چیز ہے۔ اس پر صبر کیوں کر کیا جاسکتا ہے؟ ہم نے جو باتیں پیش کی ہیں اُن کا بہت کچھ حصّہ آپ اپنے آسمانی نوشتوں میں پاسکتے ہیں۔ اور جو باتیں آپ کو نئی معلوم ہوں گی آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ باتیں انہیں باتوں کا براہِ راست تقاضا یا اُن کا تتمہ ہیں، جن کو کسی حال میں چھوڑا نہیں جاسکتا۔ ہماری اپیل آپ سے یہی ہے کہ ہماری ان باتوں پر غور کریں۔ ہم توقع رکھتے ہیں کہ ان باتوں کو آپ اپنے تمام مسائل کے حل کے لیے ان شاء اللہ مفید پائیں گے۔ لیکن اگر خدانخواستہ آپ ہماری ان باتوں کے اس حصّے کو قبول کرنے کے لیے ابھی تیار نہیں ہیں، جن کو آپ ہماری مخصوص باتیں سمجھتے ہیں تو ہماری کم سے کم آپ سے یہ خواہش ہے کہ دین دھرم کے نام سے آپ کے پاس جو کچھ بھی سرمایہ ہے اس کو آپ اپنے معاشرے اور نظام سیاست و حکومت کی بنیاد بنائیں۔ یعنی خالص خدا پرستی اور خدا کے سامنے اپنے اعمال کی جواب دہی کو بنیاد بنا کر اپنے انفرادی اور اجتماعی معاملات کو درست کرنے کی کوشش کریں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ آپ کے دلوں میں مسلمانوں سے جو بے گانگی پیدا ہوگئی ہے اس کی وجہ سے آپ اسلام یا قرآن کا نام سننے کے روادار نہ ہوں۔ لیکن اگر آپ نفس مذاہب اور خدا کے تصور سے متنفر نہ ہوگئے ہوں تو آپ کو مذہب کے ان بنیادی تصوّرات یعنی خدا پرستی اور محاسبۂ اعمال اور رسالت سے نفرت کرنے کے کوئی معنی نہیں ہوسکتے۔

آپ ان ہی اصولوں کو اپنے مسائل زندگی کے حل کرنے کی بنیاد بنائیں۔ ہمارے نزدیک مذہب کی ان بنیادی باتوں کی بنیاد پر حکومت وسیاست کا جو ڈھانچہ بھی تیار ہوگا خواہ اپنی جگہ کتنا ہی ناقص کیوں نہ ہو، وہ عہد حاضر کی قوم پرست و وطن پرست لادینی حکومتوں سے بدرجہا بہتر ثابت ہوگا۔ بشرطیکہ اس طرح کی حکومت کو چلانے والوں میں بھی سچی خدا پرستی اور آخرت کی ذمے داری کا احساس موجود ہو۔ ہم اپنی طرف سے آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ اس طرح کی کسی

نظامِ حکومت کے تحت زندگی گزارنا موجودہ لادینی نظام ہائے حکومت کے مقابلے میں نہ صرف یہ کہ گوارہ ہے بلکہ پسندیدہ بھی ہوگا۔ کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ ہندوستان ایک مرتبہ اس راستے پر پڑ گیا تو یہاں کے باشندوں کے لیے آج نہیں تو اس وقت ہماری باتوں کا سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ اور ہمیں یقین ہے کہ وہی وقت ہوگا جب ہندوستان صحیح ترقی کی راہ پر گامزن ہوگا۔ لیکن آپ اگر بُرا نہ مانیں تو میں یہاں صفائی سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان اگرچہ انگریزوں کے بند غلامی سے آزاد ہو گیا ہے لیکن جہاں تک اس کے ذہن وفکر کا تعلق ہے وہ بدستور اس کے افکار ونظریات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے، اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ یہ ملک بھی جو ہمیشہ سے روحانیت اور خدا پرستی کا دعوے دار رہا ہے، اب تک قومیت اور وطنیت جیسی مادّی چیزوں ہی کا پجاری ہے۔ حتیٰ کہ اگر اس ملک میں مذہب کے نام پر کوئی تحریک بھی اُٹھتی ہے تو مذہب کے ظاہری لبادے کے ماسوا اس کا تمام ڈھانچہ قومی اور وطنی جذبات ہی سے مرکب ہوتا ہے چنانچہ اُن کے اعمال اور اُن کی سرگرمیوں میں قومی جوش اور نسلی فخر وغرور تو قدم قدم پر نمایاں ہوتا ہے لیکن اخلاق، نیکی اور خداترسی کا وجود نہ تو ان کی سرگرمیوں میں نظر آتا ہے اور نہ جماعتی پروگراموں میں۔

اب وقت کافی گزر چکا ہے اس لیے میں سمع خراشی کی معافی چاہتے ہوئے اس اپیل پر آپ تمام حضرات سے رخصت ہونا چاہتا ہوں کہ اگر ہماری باتیں آپ کو کچھ اپیل کر سکیں تو اُن کے حاصل کرنے کے لیے آمادہ ہوں۔ اگر ہم سب کچھ کرتے رہے لیکن اپنے حقیقی خالق و مالک کی مرضی پہچاننے کی کوشش نہیں کی اور اس کی رضا حاصل کرنے کے لیے ہم نے دنیا میں اس کی مرضی کو قائم کرنے کے لیے کوئی جدوجہد نہیں کی تو اس سے بڑھ کر ہماری کوئی اور بدقسمتی نہیں ہوسکتی ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝